منشور عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام

اشاعت سوم بہ اہتمام عالمی مرکز برائے علمی تحقیقات ومشاورت

منشور کی اشاعت سوم کا مقدمہ

تمام تر حمد وثنا اس اللہ کے لئے ہے جو پوری کائنات کا رب ہے۔ صلاۃ وسلام ہو اس کے معزز پیغمبر پر، اس کی آل اور اس کے تمام اصحاب پر۔

عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام کا میثاق (منشور) دراصل وہ دستور ہے جس کی بنیاد پر ''اتحاد'' سے وابستگی اور اس میں شمولیت اختیار کی جاتی ہے۔ اسی کے نقطۂ نظر کے ذیل میں اس کے تمام پروگرام، اس کے موقف اور اس کی تمام تر سرگرمیاں طے ہوتی ہیں۔ اسی منشور کی رہنمائی میں ''اتحاد'' میں شامل اتحاد کے ممبران اس سے وابستگی کی حیثیت سے اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔

ایک دہائی یا اس سے کچھ زائد مدت قبل ''اتحاد'' کے آغاز تشکیل میں یہ منشور تیار کیا گیا تھا۔ اسے مسلمانوں کے مکاتب فکر کے اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک ایسے معتدل اسلوب میں مرتب کیا گیا ہے جو تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے۔ یہ منشور قرآن کریم اور سنت نبوی کے صحیح مآخذ پر مبنی مسلمانوں کے مشترک نقاط نظر کو زیر بحث لاتا ہے اور ان اختلافی مباحث سے گریز کرتا ہے جن میں مختلف مسالک مخصوص اجتہادات کی روشنی میں ایک دوسرے سے الگ آراء اختیار کرتے ہیں۔

عملی سطح پر یہی منشور ''اتحاد'' کی تشکیل کے وقت ہی سے اس کے موقف، اس کے بیانات اور اس کی تمام سرگرمیوں میں اس کا رہنما رہا ہے۔

یہ منشور ہی ''اتحاد'' سے وابستہ علماء کے لئے نقطۂ اجتماع ہے۔ اسی کے دائرہ میں وہ اپنی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں اور اسی کے متعین کردہ رہنما خطوط پر وہ چلتے ہیں۔ اس سے معدودے چند لوگوں ہی نے انحراف کیا ہے جو ''اتحاد'' کو چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چل کھڑے ہوئے۔

یہ اس منشور کی اعتدال پسندی، اس کے مبنی برحکمت ہونے اور اس کی ہمہ گیریت ہی کا نتیجہ ہے کہ ''اتحاد'' نے اللہ کے فضل سے ایک مختصر عرصہ میں عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ اب یہ مسلمانوں کا ایک ایسا قابل اعتماد حوالہ بن چکا ہے جو حق کا ساتھ دیتا ہے جہاں کہیں بھی ظلم ہوتا دیکھتا ہے۔ یہ اپنے امکان کی حد تک مصالحت کرانے کے لئے کوشاں رہتا ہے اور جہاں بھی اسے نقص نظر آتا ہے، نقاط نظر کی اصلاح کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے۔

لوگوں کے درمیان اس منشور کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ یہ ''اتحاد'' میں شامل افراد کے دائرہ سے نکل کر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تک پھیل گیا۔ اس قبول عام کی وجہ منشور کے مختلف زبانوں میں وہ ترجمے ہیں جو بڑی تعداد میں مسلمانوں کے درمیان شائع ہوئے۔ اب یہ میثاق اس اہمیت کا حامل ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کے حلقہ میں ایک ایسے عمومی کلچر کی تشکیل کر سکے جو تسلسل کے ساتھ وسعت اختیار کرے اور اللہ کے حکم سے پاکیزہ پھل دے۔

بایں ہمہ یہ منشور ایک انسانی کاوش ہے جس میں خامیوں کے در آنے کا پورا پورا امکان ہے، اسی کے ساتھ ساتھ تازہ ترین واقعات

اور ہنگامی نوعیت کے مسائل کے پیش نظر اس میں اضافہ یا ترمیم کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، اس لئے اسے خوب سے خوب تر بنانے کے مقصد سے اس پر نظر ثانی، اس میں اضافہ یا ترمیم ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن کے مقابلہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں عملاً اس ضرورت کی تکمیل کی گئی ہے۔

اب ''اتحاد'' اس کا تیسرا ایڈیشن مسلمانوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہے تا کہ اس کی اشاعت عام ہو، اس کی افادیت کا دائرہ وسیع ہو، اور اس پر تنقید و نظر ثانی کا سلسلہ شروع ہو پھر ان تنقیدی آراء کی روشنی میں اللہ نے چاہا تو ''اتحاد'' کی جنرل باڈی کی خدمت میں یہ مزید ترمیم و اضافہ کی تجاویز پیش کی جا سکیں۔

ہم ہمیشہ اضافہ کے طالب رہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی مغفرت چاہتے ہیں جیسا کہ ہم سے پہلے کے لوگ کہہ چکے ہیں:
اللہ تعالیٰ ہی توفیق کا مالک ہے۔

یوسف القرضاوی
صدر عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام

مقدمہ طبع اول

خدا کا شکر ہے جس کی عنایت سے اعمال صالحہ پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ جس نے ہمیں اس کام کی رہنمائی فرمائی۔ اگر اس کی رہنمائی ہمارے شامل حال نہ ہوتی تو ہم راہ یاب نہ ہوتے۔ اللہ کی پاکیزہ صلوات وتسلیمات ہوں اس ہستی پر جسے اس نے سارے جہاں کے لئے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا، اہل ایمان کے لئے اسے ایک عظیم نعمت بنایا اور پوری انسانیت پر اسے ایک حجت قرار دیا یعنی ہمارے قائد، ہمارے سردار، ہمارے اسوہ، ہمارے محبوب اور ہمارے معلم حضرت محمد صادق وامین پر، ان کی اولا د اطہار پر، ان کے درخشندہ اور بابرکت اصحاب پر اور ان تمام افراد پر اللہ تعالیٰ کی کامل عنایتیں ہوں جو جزا کے دن تک ان سب کی بحسن وخوبی پیروی کرتے رہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت، اس کی مہربانی، اس کی توفیق اور اس کی طرف سے کی گئی درست راستہ کی رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ امت مسلمہ کے منتخب علماء کی ایک جمعیت ''عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام'' کی تشکیل کی دعوت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اتحاد'' کا مقصد یہ ہے کہ روئے زمین کے مشرق ومغرب میں موجود امت مسلمہ کو درپیش نازک صورت حالات کے مقابلہ کے لئے متحد کیا جائے اور اس کی صف بندی کی جائے۔

''اتحاد'' چاہتا ہے کہ قرآن وسنت کے ٹھوس اصولوں پر مبنی اپنا خالص اور بے آمیز دینی موقف لوگوں کے سامنے پیش کرے اور عالمی احوال اور علاقائی ظروف کا درست تجزیہ کر کے عملی صورت حال کے حوالہ سے صحیح نقطۂ نظر اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اسے کسی ملامت گر کی ملامت اور کسی ظالم کے انتقام کا خوف دامن گیر نہ ہو، وہ اللہ کی رضا کو مدنظر رکھتے ہوئے حکمرانوں سے خیر خواہی کا حق ادا کرے اور امت کی تمام توانائیوں کو آزادی، وحدت اور تعمیر کے راستہ پر لگا دے۔ اسی لئے ''اتحاد'' نے اپنا شعار اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد کو بنایا ہے:

''الذين يبلغون رسالات الله و يخشونه ولا يخشون أحداً إلا الله و كفى بالله حسيبا'' (الأحزاب: ۳۳/۳۹)۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب یہ ''اتحاد'' وجود میں آچکا ہے۔ اس نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔ اس کی طرف سے بیانات اور فتاوے بھی جاری کئے جاتے ہیں اور یہ اپنی تشکیل کے تمام تقاضوں کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے۔

''اتحاد'' کی ''کونسل برائے سکریٹریز'' کی تجویز ہے کہ ''اتحاد'' کا ایک منشور (میثاق) ہونا چاہئے جس سے اہم مسائل کے بارے میں اس کے دینی موقف اور نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے۔ اس منشور کی حیثیت ایک ایسی اساس اور ایک ایسے محور کی ہو جس کو مدنظر رکھ کر ہی لوگ اس سے وابستہ ہوں۔ ''اتحاد'' اپنی ''کمیٹی برائے فتاوی وتحقیقات''، اپنی ''مجلس عاملہ'' اور اپنی ''کونسل برائے سکریٹریز'' کے ساتھ ایک سال سے زائد مدت تک اس منشور کے مسودہ پر غور وخوض میں مصروف رہا۔ علماء برادری کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ صلاح ومشورہ کے بعد ''اتحاد'' اب یہ میثاق اس امید کے ساتھ منظر عام پر لا رہا ہے کہ یہ اسلام کی خالص اور عصری تفہیم کا ایک نقطۂ آغاز ہوگا، معاصر اسلامی فکر کی تصحیح میں اس سے مدد ملے گی اور افکار اور تہذیبوں کے درمیان مذاکرات میں اس فکر کے رہنما کردار کا تحفظ ہو سکے گا۔

اس منشور کے توسط سے ہم تمام مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ''اتحاد'' کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں اور انتشار، انتہا پسندی اور جمود کے تمام نعروں کو مسترد کر دیں۔ اسی طرح ہم اس منشور کے ذریعہ عالمی رائے عامہ کی خدمت میں تمام آسمانی ادیان کی تکمیل کرنے والے عظیم الشان دین اسلام کے واضح خطوط کا تعارف اور موجودہ دور میں درپیش مسائل کے حوالہ سے اسلام کا موقف پیش کر رہے ہیں۔

جہاں تک روئے زمین کے اطراف واکناف میں پھیلی اس علماء برادری کا تعلق ہے جو وسعت نظر، وسعت قلب اور اختلاف رائے

رکھنے والے کے ساتھ رواداری کی نعمت سے مالا مال ہے تو ہم اپنے نقطۂ نظر کا تعین کرنے والے اور اہم اعتقادی، عملی، فکری اور سماجی مسائل کے حوالہ سے اپنے موقف کی وضاحت کرنے والے یہ اصول وقواعد اس کی خدمت میں بھی پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں باہم متحد ہوں گے اور یہ اصول ان کے خطبات، ان کے دروس اور ان کی ہدایات کا محور قرار پائیں گے۔ اس لئے ہماری درخواست ہے کہ وہ ان اصول وقواعد کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ وہ ہمیں ''اتحاد'' کے نقطۂ نظر سے اتفاق اور اس میں شمولیت کے لئے آمادگی کے حوالہ سے اپنی مختصر تحریر بھی ارسال فرمادیں۔ اسی طرح ہم منشور کے متعلق ان کی تفصیلی آراء کے بھی منتظر ہیں تاکہ آئندہ کی اشاعتوں میں نظر ثانی یا ترمیم کے وقت ان سے استفادہ کر سکیں۔

ایک مسلمان عالم کے لئے بعض مسال میں دوسروں سے مختلف رائے رکھنا باعث مضرت نہیں، اس کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ اجمالاً نہ کہ تفصیلاً اس منشور سے اتفاق کرے اور اس کے بیش تر حصہ کو قبول کرے، کیونکہ جزئیات میں اتفاق رائے مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

اہم چیز سمت کی درستگی ''**فاستقم كما امرت و من تاب معک ولا تطغوا إنه بما تعملون بصير**'' (ھود:۱۱۱-۱۱۲) اور خلوص نیت ہے ''**و إنما لكل امرئ ما نوى**'' (حدیث متفق علیہ بروایت حضرت)۔

(ہر شخص کو نیت کے مطابق جزا ملے گی)۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتے ہیں کہ ہماری نیتوں کو اپنی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لئے خالص کردے اور اپنے دین کی نصرت اور اعلاء کلمۃ اللہ کو ہمارا ہدف بنادے۔ **ربنا عليک توكلنا و إليک أنبنا و إليک المصير۔**

ربنا لاتجعلنا فتنة للذين كفروا، واغفر لنا ربنا، إنک أنت العزيز الحكيم۔ (الممتحنۃ:۶۵/۴-۵)۔

یوسف القرضاوی

صدر عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام

امت مسلمہ: تشخص اور خصوصیات

امت مسلمہ ایک اعتدال پسند امت ہے۔ قرآن نے اس کا یہ وصف بیان کیا ہے: "**وکذلک جعلناکم أمة وسطا لتکونوا شهداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شهیدا**" (البقرة: ۲/ ۱۴۳)۔

یہ ایک عقیدہ اور ایک پیغام کی حامل امت ہے۔ یہ کوئی نسلی امت نہیں ہے جو کسی خاص قوم یا کسی متعین نسل سے منسوب ہو، نہ یہ کوئی علاقائی امت ہے جو مشرق یا مغرب کے کسی ملک یا کسی خطۂ ارض سے انتساب رکھتی ہو۔ یہ کوئی لسانی امت بھی نہیں ہے جس کا تعلق کسی ایک متعین زبان سے ہو۔

یہ ایک عالمی امت ہے جس کے افراد کو رنگ و نسل اور زبان و وطن کے اختلاف و تنوع کے باوجود ایک عقیدہ، ایک شریعت، مشترک اقدار اور ایک قبلہ نے باہم متحد کر رکھا ہے۔

قومیتوں کے تنوع کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اس امت کے لسانی تنوع کے باوجود اس کا ایک مشترک لسانی امتیاز بھی ہے۔ یعنی عربی زبان جو تمام مسلمانوں کے درمیان رابطہ کی واحد زبان ہے۔ یہ ان کے درمیان عبادت، اسلامی ثقافت اور اسلامی تمدن کی وہ زبان ہے جسے ان ہزاروں عبقری اہل قلم نے اپنی اپنی تخلیقات سے مالا مال کیا ہے جن میں سے بیشتر غریب عرب ہیں۔

اس امت میں عربی بھی ہیں، عجمی بھی، گورے بھی ہیں کالے بھی، مشرقی بھی ہیں، مغربی بھی، افریقی بھی ہیں یوروپی بھی، ایشیائی بھی ہیں، امریکی بھی، آسٹریلیائی بھی۔ اسلام ان سب کو ایک کلمہ پر متحد کرتا ہے، ان کے اندر سے انسانوں کو باہم منقطع کرنے والے رنگ و نسل اور زبان و علاقہ کے امتیازات اور طبقاتی تفریق کو مٹا دیتا ہے۔ اسلام علانیہ ان سب کو ایک امت قرار دیتا ہے جن کو ایک گہری اخوت باہم مربوط رکھتی ہے۔ اس اخوت کی اساس ایک رب، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک نظام پر ایمان ہے۔ یہی اساس اس کی شیرازہ بندی کرتی ہے اور اس کے باہمی رشتوں کو مستحکم کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**و أن هذا صراطی مستقیما فاتبعوه، ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیله، ذلکم وصاکم به لعلکم تتقون**" (الأنعام: ۶/ ۱۵۳)۔

ایک مسلمان اپنے وطن اور اپنی قوم سے محبت اور ان پر فخر میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا بشرطیکہ اس کی وطنی اور قومی محبت اور اس کا وطنی اور قومی افتخار اس کی دینی محبت اور اس کے دینی افتخار سے متصادم اور امت مسلمہ کے اتحاد کے منافی نہ ہو، کیونکہ اسلام تمام انسانی دائروں بشمول قومی، وطنی اور نسلی خصائص کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کی نظر میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ دائرے اسلام مخالف تصورات کے حامل ہوں یا عصبیت کی گود میں جا گریں۔

اس امت کی بنیاد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہے۔ اس امت کی خصوصیت اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق یہ ہے: "کنتم خیر أمة أخرجت للناس" (آل عمران: ۳/ ۱۱۰)۔ یہ ایک ایسی امت ہے جو اپنے لئے پیدا نہیں کی گئی بلکہ لوگوں کی خاطر، لوگوں کے فائدے کے لیے، لوگوں کی رہنمائی کے لے اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے وجود میں لائی گئی۔ اس کا حامل خیر ہونا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنا پر ہے: "**تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تؤمنون بالله**" (آل عمران: ۳/ ۱۱۰)۔

لہٰذا یہ امت ایک ربانی پیغام اور ایک عالمی انسانی / اخلاقی منصب کی حامل امت ہے۔اس کے پیغام کا خلاصہ مندرجہ ذیل دو امور ہیں:

اول: اللہ واحد پر ایمان۔اس میں تین اساسی امور شامل ہیں:

۱-اللہ کے سوا کسی کو رب تسلیم نہ کرنا۔

۲-اللہ کے سوا کسی کو کارساز نہ بنانا۔

۳-اللہ کے سوا کسی کو فیصل نہ قرار دینا۔

یہ توحید کے وہ عناصر سہ گانہ ہیں جو مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر میں عقیدہ کی اساس تسلیم کئے جاتے ہیں۔

دوم: یہ امت لوگوں کو حق، خیر اور اعلیٰ اقدار کی دعوت دینے پر مامور ہے۔قرآن نے اسی فریضہ کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے تعبیر کیا ہے۔معروف ایک جامع اصطلاح ہے۔اس میں اعتقادیات سے متعلق تمام امور حق، قول میں راست بازی، رائے میں اصابت، افعال میں خیر اور اعمال میں درستگی سب شامل ہیں۔

اس کے برعکس منکر کی اصطلاح عقائد سے متعلق تمام امور باطلہ، قول میں کذب بیانی، رائے میں سطحیت، افعال میں شر اور اعمال میں زیغ وضلال سب کو محیط ہے۔

امت سے اس فریضہ کی ادائیگی مطلوب ہے تاکہ تمام شعبہ ہائے زندگی میں کجی کی اصلاح اور فساد کا ازالہ ہو سکے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير و يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر، و أولئک هم المفلحون“ (آل عمران: ۳/ ۱۰۴)۔

اس امت کو تاریخ کے مختلف ادوار میں طرح طرح کی آزمائشوں، امتحانات، حملوں اور یورشوں کا سامنا رہا ہے جیسے مشرق کی طرف سے پیش آنے والے مغلوں کے حملے اور مغرب کی طرف سے کئے گئے انگریز صلیبیوں کے حملے۔

قریب تھا کہ ان حملوں کے نتیجہ میں اس کا وجود ختم ہو جائے مگر جلد ہی اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے عماد الدین، نور الدین، صلاح الدین اور قطز جیسی ہستیوں کو کھڑا کر دیا جنھوں نے اس امت کو از سر نو زندہ کیا اور اسے متحد کیا۔ان شخصیات کی جد وجہد کے نتیجہ میں اس امت کی حیات بخش اور توانائی سے بھرپور صلاحیت پھر سے بحال ہوگئی، اس نے حملہ آوروں کو کھدیڑ دیا اور زندگی کی طرف لوٹ آئی یا زندگی اس کی طرف پلٹ آئی۔

آج بھی اس امت کو نوع بہ نوع یورش و یلغار کا سامنا ہے، یہ حملے اس کو داخلی سطح پر اور خود اسی کے افراد کے ہاتھوں اسے بدل دینا چاہتے ہیں۔ان حملوں کا ہدف امت کے تشخص، اس کے عقائد، اس کے نظریۂ دین اور زندگی، اس کے نظریۂ فرد و اجتماع، اس کے تصور خلق و خالق، اس کے تصور دنیا و آخرت اور اس کے تصور انسان و عالم کو پوری طرح تبدیل کر دینا ہے۔

یہ امت اس نئے طاغوت کے مقابلہ میں صرف اسی طرح کھڑی رہ سکتی ہے کہ اپنے رب کی رسی کو مضبوطی سے تھام لے اور اپنے نہ ٹوٹنے والے مستحکم ستون سے پوری طرح چمٹ جائے۔یہ ستون صرف اور صرف اسلام کا ستون ہے۔اسے حضرت عمر بن الخطاب کے اس بیان کو اپنے پیش نظر رکھنا ہوگا: ”ہم سب سے کم تر لوگ تھے، ہمیں اللہ نے اسلام کی بہ دولت اعزاز بخشا، اب جب کبھی بھی ہم اسلام کو چھوڑ کر کسی

اورذریعہ سے سربلندی کے طالب ہوں گے تو اللہ ہمیں ذلیل وخوار کردے گا۔

(حضرت عمر کے اس قول کی روایت ابن أبی شیبہ نے اپنی المصنف، کتاب التاریخ (۳۳۸۴۶)، طبرانی نے المعجم الکبیر (۲۳/ ۱۲۴) میں اور حاکم نے المستدرک، کتاب الایمان (۱/ ۱۳۰) میں کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ یہ روایت شیخین کی شرط پر صحیح ہے، کیونکہ ان دونوں نے متفقہ طور پر ایوب بن عائذ الطائی اور اس روایت کے بقیہ تمام راویوں کی مرویات سے استدلال کیا ہے اگرچہ خود اس روایت کو نقل نہیں کیا ہے)۔

اس امت کو چاہئے کہ امام دار الہجرۃ مالک بن انس کے مندرجہ ذیل ارشاد کو جرز جان بنالے: اس امت کے آخری دور کی اصلاح صرف اسی طریقہ سے ہوسکتی ہے جس سے اس کے پہلے دور کی ہوئی تھی اور اس کے دور اول کی اصلاح اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کی سنت ہی سے ہوئی تھی۔ یہ امت ''اللہ تعالی کے درج ذیل ارشاد کو اپنا شعار بنائے: ''**واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا**'' (آل عمران: ۳/ ۱۰۳)۔

☆☆☆

اللہ واحد پر ایمان رکھنے والی امت

اولین بنیاد جس پر امت کا دارو مدار اور اس کا وجود برقرار ہے، اسلامی عقیدہ ہے۔

اسی لئے اس امت کا پیغام ہے کہ اس عقیدہ کی آبیاری کی جائے، اس کو پروان چڑھایا جائے، اسے مستحکم کیا جائے، اس کا تحفظ کیا جائے اور اس کی روشنی کو اطراف عالم میں پھیلایا جائے۔

اسلامی عقیدہ کی تشکیل اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان و اعتقاد کی صورت میں ہوتی ہے:

"آمن الرسول بما أنزل إليه من ربه والمؤمنون، كل آمن بالله و ملائكته و كتبه ورسله، لانفرق بين أحد من رسله وقالوا سمعنا و أطعنا، غفرانک ربنا و إلیک المصير" (البقرۃ:۲/۲۸۵)۔

اس عقیدہ کا مقصد تعمیر ہے نہ کہ تخریب، صف بندی ہے نہ کہ تفریق، کیونکہ اس کی بنیاد تمام الٰہی پیغامات کے ورثہ اور اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان ہے: **"لانفرق بين أحد من رسله"** (البقرہ:۲/۲۸۵)۔ **"ومن يكفر بالله وملائكته و كتبه ورسله واليوم الآخر فقد ضل ضلالاً بعيداً"** (النساء:۴/۱۳۶)۔

سنت نے ان پنج گانہ قرآنی ارکان میں "ایمان بالقدر" کا اضافہ کیا ہے۔ یہ دراصل ایمان باللہ میں شامل ہے۔ کیونکہ تقدیر پر ایمان اللہ تعالیٰ کے علم وارادہ اور اس کی قدرت سے متعلق ہے۔ اس لئے کہ کائنات میں جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی تقدیر و تدبیر ہی سے ہوتا ہے۔ از راہ فضول و عبث نہیں ہوتا۔ **"إنا كل شئ خلقناه بقدر"** (القمرڑ ۵۴/۴۹)، **"ما أصاب من مضيبة فى الأرض ولا فى أنفسكم إلا فى كتاب من قبل أن نبرأها، إن ذلك على الله يسير، لكيلاً تأسوا على ما فاتكم ولا تفرحوا بما آتاكم"** (الحدید:۲/۲۳)۔

اس عقیدہ کا ایک عنوان ہے جس سے اس کا خلاصہ ہوتا ہے یا ایک شعار ہے جس سے اس کی ترجمانی ہوتی ہے اور وہ ہے: "اس امر کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں"۔ یہ عقیدہ ہی کائنات، رب کائنات، فطرت، ماورائے فطرت، حیات، مابعد حیات، عالم مرئی نیز عالم غیر مرئی بالفاظ دیگر خلق و خالق، دنیا و آخرت اور عالم غیب و شہود کے حوالہ سے اہل اسلام کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔

دنیا میں جو اس حقیقت سے منحرف ہوگا آخرت میں اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹے گی اور وہ حقیقت کا کھلے عام مشاہدہ کرے گا، جیسے کہ دن کے وقت آفتاب کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ **"إن كل من فى السماوات والأرض إلا آتى الرحمن عبدا، لقد أحصاهم و عدهم عدا، وكلهم آتيه يوم القيامة فردا"** (مریم:۱۹/ ۹۳-۹۵)۔

یہی مفہوم ہے **"لا إله إلا الله"** کا، یعنی اس کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں...... یا یہ کہ اگر پوری کائنات میں کوئی اس کا مستحق ہے کہ اس کے حضور عجز و تذلیل اختیار کیا جائے تو وہ صرف اور صرف اللہ ہی ہے۔ **"إياک نعبد و إياک نستعين"** (الفاتحۃ:۱/۵)۔

ایک تنہا اسی کی ذات ہے جس کے حکم کے آگے گردنیں جھک جاتی ہیں، جس کی تعظیم میں پیشانیاں سجدہ ریز ہوجاتی ہیں، جس کی تسبیح و تحمید میں زبانیں رطب اللسان ہوتی ہیں اور جس کے فیصلے کے دل، دماغ اور جسم مطیع ومنقاد ہوتے ہیں۔

ایک اسی کی ذات ہے جس کی طرف دل ہر طرح کی محبت کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کمالات میں منفرد ہے۔ کمال کا حق ہے کہ اس سے اور صاحب کمال سے محبت کی جائے۔ وہی ذات ہر طرح کے حسن و جمال کا منبع بھی ہے۔ کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی جمال ہے، وہ اسی سے ماخوذ ہے۔ جمال کا حق ہے کہ اس سے اور صاحب جمال سے محبت کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہی تمام نعمتوں کا عطا فرمانے والا اور ہر نوع کے احسان کا سرچشمہ ہے ''وما بكم من نعمة فمن الله'' (النحل:١٦/ ١٥٣)۔

احسان ہمیشہ محبوب ہوتا ہے، نعمت ہمیشہ محبوب ہوتی ہے اور صاحب نعمت سے ہمیشہ محبت کی جاتی ہے۔

''لا إلہ إلا اللہ'' کا مفہوم ہے: خدا کے اقتدار کو چھوڑ کر ہر اقتدار کو تسلیم کرنے، اس کے آگے جھکنے، اس کے فیصلے کے سوا ہر کسی کے فیصلے کو قبول کرنے، اس کے فرمان کے سوا ہر فرمان کی تعمیل کرنے سے کلی طور پر انکار، وفاداری صرف اسی سے اور محبت صرف اسی سے اور اسی کی راہ میں۔

اس پاکیزہ کلمہ کی مثال ایک پاکیزہ درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی اور اس کی شاخیں آسمان میں بلند ہوتی ہیں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت اپنا پھل دیتا رہتا ہے۔

اس کا فیض اور اس کا سب سے پاکیزہ پھل عقل و وجدان کا ہر مخلوق کی غلامی اور خوف سے آزاد ہونا، تکبر اور سرکشی کے محرکات سے گلوخلاصی اور تمام انسانوں کے درمیان مساوات کا حقیقی احساس ہے۔ اب انسانوں میں سے کچھ لوگ دوسرے انسانوں کے رب نہیں ہیں بلکہ سب کے سب اصل کے اعتبار سے سگے بھائی ہیں جن کا باپ بھی ایک ہے اور ماں بھی ایک۔

اسی لئے اہل کتاب کے امراء اور حکمرانوں کے نام آپؐ کے خطوط پر درج ذیل آیت کی مہر ہوتی تھی: ''**قل يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا و بينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئاً ولا يتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون الله**'' (آل عمران: ٣/ ٦٤)۔

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام پاپائیت سے ناآشنا ہے۔ اسلام میں کوئی ایسا پاپائی طبقہ نہیں پایا جاتا جس کا دین پر اجارہ ہو، جو لوگوں کے قلوب پر مسلط ہو، خدا کا دروازہ بندگان خدا پر صرف اسی کے توسط سے کھلتا ہو اور محرومی کے فیصلے یا مغفرت کے پروانے صرف اسی کی طرف سے صادر ہو سکتے ہوں۔ اسلام میں سب لوگ اہل دین ہیں، یہاں انسان کو اپنے اور خدا کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ خدا انسان سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، ایک مسلمان اپنی نماز اور اپنے رب کا فریضہ روئے زمین کے جس گوشہ میں چاہے، ادا کرسکتا ہے، پیغمبر اسلام کا فرمان ہے: ''میرے لئے پوری زمین وسجدہ گاہ اور طہارت کا ذریعہ بنائی گئی۔ میری امت کا کوئی فرد نماز کو جہاں پائے وہیں ادا کرلے'' (صحیح بخاری، کتاب التیمم، باب قولہ تعالیٰ'' فلم تجدوا ماءً فتيمموا'' حدیث نمبر: ٣٣٢، بروایت جابر بن عبداللہ۔ صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ حدیث نمبر: ٨١٠، بروایت حضرت جابر)۔

امام نماز میں پیشوا ہوتا ہے نہ کہ پروہت۔ شرعی شرائط کے ذیل میں ہر مسلمان لوگوں کی نماز کی امامت کراسکتا ہے۔

ایک مسلمان بغیر کسی واسطہ کے اپنے تمام فرائض ادا کرسکتا ہے۔

آج کل جولوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مثال کے طور پر حج میں ایک طواف کرانے والا ہونا ضروری ہے تو دین میں اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کیونکہ حج میں کسی تلقین کرنے والے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک مسلمان کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ اپنی عبادت کا طریقہ سیکھ لے تاکہ اللہ کے حکم کے مطابق اسے ادا کرسکے۔ صغیرہ یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے والے ایک مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضوء، نماز، روزہ، صدقہ، ذکر الٰہی دنیا کی ابتلا وآزمائش نیز توبہ واستغفار کو آزالۂ فساد کا ذریعہ اور کفارہ قرار دیا ہے۔ توبہ واستغفار کے لئے کسی پادری کی ضرورت نہیں ہے جس کے سامنے جا کر ایک شخص اپنے گناہوں کا اقرار کرے اور اللہ کی بارگاہ میں اسے وسیلہ بنائے۔" **وإذا سألك عبادي عني فإني قريب، أجيب دعوة الداع إذا دعان**" (البقرہ:۲/۱۸۹)۔ "**قل يا عبادي الذين أسرفوا على أنفسهم لا تقنطوا من رحمة الله، إن الله يغفر الذنوب جميعا، إنه هو الغفور الرحيم**" (الزمر:۳۹/۵۳)۔

اسلام کی نظر میں علماء دین انبیاء کے وارث اور امت کے قائد ہیں۔ یہ اپنے اپنے میدان کے ماہرین ہیں۔ ان سے اسی طرح رجوع کیا جائے گا جس طرح ہر علم والے سے اس کے علم کے سلسلہ میں رجوع کیا جاتا ہے۔ "**فأسأل به خبيرا**" (الفرقان:۲۵/۵۹)۔ "**ولا ينبئک مثل خبير**" (فاطر:۳۵/۱۴)۔ "**فاسألوا أهل الذكر إن كنتم لاتعلمون**" (النحل:۱۶/۴۳)۔

ہر مسلمان کو حق ہے وہ جب چاہے تحقیق واختصاص کے ذریعہ دین کا عالم بن سکتا ہے۔ یہ حق موروثی طور پر یا لقب اختیار کرکے یا لبادہ اوڑھنے سے نہیں حاصل ہوسکتا۔ اس پر نہ کسی کا اجارہ ہے اور نہ کسی پر کوئی قدغن۔

اسلام افراد اور اداروں میں درآمد کی گئی دینی اور غیر دینی کی تقسیم کو مسترد کرتا ہے۔ یہاں افراد، تعلیم، قوانین اور اداروں کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسلام میں یہ سب کے سب دین کی خدمت پر مامور ہیں۔

یوم آخرت پر ایمان

ہمارا ایمان ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے نیز یہ کہ انسان ہمیشہ رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ موت تو صرف اسے ایک مقام سے دوسرے مقام تک یعنی مرکز امتحان سے مرکز جزا تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ آج عمل ہے، محاسبہ نہیں، کل محاسبہ ہوگا عمل نہیں۔ اخروی زندگی میں ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزا ملے گی اور وہاں وہ اپنے عمل کے مناسب حال صورت میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا: "**يومئذ يصدر الناس أشتاتاً ليروا أعمالهم فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره، من يعمل مثقال ذرة شرا يره**" (الزلزلۃ:۹۹/۶-۸)۔

تمام آسمانی مذاہب نے آخرت پر ایمان، جزاوسزا اور جنت ودوزخ کی تعلیم دی ہے۔ اسلام نے بہ طور خاص موت کے بعد کی زندگی کے مسئلہ کو قرآن کا ایک محور بنایا ہے۔ اسلام نے ان مشرکین عرب سے مباحثہ کیا ہے جو موت کے بعد زندگی کو ناممکن تصور کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ پہلو واضح کرتا ہے۔

'**يبدأ الخلق ثم يعيده وهو أهون عليه ......**" (الروم:۳۰/۲۷)۔ قرآن کا بیان ہے: "**خلق السماوات والأرض قادر على أن يخلق مثلهم**" (الإسراء:۱۷/۹۹)۔

قرآن ان کو بتاتا ہے کہ عظمت، علم اور قدرت کی صفات سے متصف معبود کے وجود کی حکمت تقاضہ کرتی ہے کہ تخلیق کے اس بازار کی بساط یوں ہی نہ لپیٹ دی جائے کہ قاتل، سرکش، باغی، ظالم اپنے کئے کی سزا سے بچ جائیں اور مظلوم کو اس کا حق نہ مل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وما خلقنا السماء والأرض وما بينهما باطلاً، ذلک ظن الذين کفروا فويل للذين کفروا من النار، أم نجعل الذين آمنوا و عملوا الصالحات کالمفسدين فی الأرض أم نجعل المتقين کالفجار" (ص:۳۸/۲۷-۲۸)۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:"أفحسبتم أنما خلقناکم عبثا و أنکم إلينا لاترجعون، فتعالی الله الملک الحق لا إله إلا هو رب العرش الکريم" (المؤمنون:۲۳/۱۱۵)۔
قرآن کا موقف یہ ہے کہ اگر جزاوسزا کے فیصلہ کے لئے موت کے بعد کوئی زندگی نہ ہوتو انسان کی تخلیق فضول، بے مقصد اور غیر حکیمانہ ہے۔ مادہ پرستوں اور دہریوں کا یہی تخیل ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں موت اور زندگی سے سابقہ پیش آتا ہے اور ہمارا خاتمہ صرف زمانہ کرتا ہے۔ یہ صرف زمین ہے جو انسان کو نگل لیتی ہے اور اس کے بعد کچھ نہیں رہتا۔
اگر زندگی کا انجام اور حاصل یہی ہے تو کتنی حقیر اور معمولی ہے یہ زندگی!!
قرآن نے ان مشرکین کے موقف کی تردید کی ہے جو زندگی بعد موت کا انکار کرتے تھے اور اللہ کے لئے اسے ناممکن تصور کرتے تھے کہ وہ بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ جان ڈال دے گا۔ قرآن نے ان لوگوں کے عقائد کو بھی مسترد کردیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نظام عدل وحکمت سے اندھے ہوکر یہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کا ورق یوں ہی لپیٹ دیا جائے گا اور نیکوکار کو اس کی نیکی کا اور بدعمل کو اس کی بدعملی کا کوئی بدلہ نہ ملے گا جیسے کہ اس کائنات کا کوئی پروردگار اور منتظم سرے ہو ہی نہ۔
قرآن نے ان لوگوں کے خیال کی بھی تردید کی ہے جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آخرت میں انہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع پہنچائے گی، ان کے سفارشی اپنے اثر ورسوخ سے قانون عدل کو بے اثر کردیں گے، اسی طرح یہ کہ کچھ لوگ مظالم اور سنگین جرائم کا ارتکاب کریں گے پھر ان کے معبودان باطلہ جن کو یہ خدا کو چھوڑ کر پوجتے رہے ہیں یا ان کے مذہبی پیشوا جن کو یہ اپنے اور خدا کے مابین واسطہ قرار دیتے رہے ہیں، ان کے لئے سفارشیں کریں گے۔ یہی وہم مشرکوں اور بعض اہل کتاب کو بھی تھا۔ قرآن نے شدت اور پوری وضاحت کے ساتھ اس بے بنیاد دعوے کو باطل ٹھہرایا ہے۔ قرآن کا بیان ہے:"من عمل صالحاً فلنفسه، ومن أساء فعليها، وما ربک بظلام للعبيد" (فصلت:۴۱/۴۶)۔ " من اهتدی فإنما يهتدی لنفسه ومن ضل فإنما يضل عليها ولاتزروا وازرة وزر أخری" (الإسراء: ۱۷/۱۵)۔"من ذا الذی يشفع عنده إلا بإذنه" (البقرہ:۲/۲۵۵)۔"وکم م ملک فی السماوات لاتغنی شفاعتهم شيئاً إلا من بعد أن يأذن الله لمن يشاء ويرضی" (النجم:۵۳/۲۶)۔"ولايشفعون إلا لمن ارتضی" (الأنبیاء:۲۱/۲۸)۔ مجرم مشرکوں کے حوالہ سے قرآن کہتا ہے:"فما تنفعهم شفاعة الشافعين" (المدثر:۷۴/۴۸)۔ قرآن نے یہ واضح کردیا ہے کہ شفاعت صرف اللہ تعالیٰ کی اجازت ہی سے ہوسکتی ہے اور کسی کی یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر کسی فرشتہ یا کسی پیغمبر کی سفارش تھوپے۔
قرآن نے یہ بھی بیان کردیا ہے کہ شفاعت ہر شخص کے لئے عام نہیں ہے۔ چنانچہ جس کی موت اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اور کفر پر اصرار کی حالت میں ہوگی اللہ تعالیٰ اس کے حق میں کسی کو سفارش کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اگر کوئی ایسی سفارش کرے گا بھی تو اس کی سفارش مسترد کردی جائے گی، کیوکہ شفاعت صرف اہل ایمان اور اہل توحید کے چھوٹے موٹے گناہ کرنے والوں کے حق میں مفید ہوگی۔
آخرت میں اعمال کے دفاتر سامنے لائے جائیں گے اور میزان مقرر کی جائے گی۔ ہر شخص اپنا اعمال نامہ پڑھے گا:"اقرأ کتابک کفی بنفسک اليوم عليک حسيبا" (الإسراء:۱۷/۱۴)۔"ووضع الکتاب فتری المجرمين مشفقين مما فيه و يقولون يا ويلتنا مال هذا الکتاب لايغادر صغيرة و لاکبيرة إلا أحصاها و وجدوا ما عملوا حاضراً و لايظلم ربک

أحداً'' (الکہف:۱۸/۴۹)۔''یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضراً وما عملت من سوء تود لو أن بینها و بینه أمداً بعیداً'' (آل عمران:۳۰)۔یہاں انسان کو اس کا عمل ملے گا اور وہ اپنا عمل اپنے سامنے دیکھے گا۔''ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق'' (الجاثیۃ:۴۵/۲۹)۔

اس طرح یہ دفتر عمل لوگوں کے سامنے حق بولے گا اور میزان عدل کے ساتھ فیصلہ سنائے گی:''ونضع الموازین القسط لیوم القیامة فلا تظلم نفس شیئاً و إن کان مثقال حبة من خردل أتینابها وکفی بنا حاسبین'' (الأنبیاء:۲۱/۴۷)۔

اس کے بعد یہ صورت حال اپنے اختتام کو پہنچے گی اور لوگ درج ذیل تین زمروں میں تقسیم ہو جائیں گے:

- سابقین مقربین۔
- اصحاب الیمین۔
- اصحاب الشمال۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ میں ان تینوں گروہوں کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

''فأما إن کان من المقربین فروح و ریحان و جنة نعیم و أما إن کان من أصحاب الیمین فسلام لک من أصحاب الیمین و أما إن کان من المکذبین الضالین فنزل من حمیم وتصلیة جحیم إن ھذا لھو حق الیقین'' (الواقعۃ: ۵۶/۸۸-۹۵)۔

جنت میں انواع واقسام کی مادی اور روحانی نعمتیں ہوں گی جن کو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھا ہوگا، نہ کسی کان نے کبھی ان کے بارے میں کچھ سنا ہوگا اور نہ کسی انسان کے دل میں کبھی ان کا خیال آیا ہوگا:''فلا تعلم نفس ما أخفی لھم من قرة أعین جزائا بما کانوا یعملون'' (السجدۃ:۳۲/۱۷)۔ ''وعد اللہ المؤمنین والمؤمنات جنات تجری من تحتھا الأنھار خالدین فیھا و مساکن طیبة فی جنات عدن و رضوان من اللہ أکبر ذلک ھو الفوز العظیم'' (التوبۃ:۹/۷۲)۔

دوسری طرف جہنم میں طرح طرح کے مادی اور روحانی عذاب ہوں گے جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور اہل ایمان کو ان سے خبردار کر کے ان کا خوف دلایا ہے:''قو أنفسکم و أھلیکم نارا و قودھا الناس والحجارة علیھا ملائکة غلاظ شداد لایعصون اللہ ما أمرھم ویفعلون ما یؤمرون'' (التحریم:۶۶/۶)۔''کلما نضجت جلودھم بدلناھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب'' (النساء:۴/۵۶)۔

اللہ کے تمام پیغمبروں پر ایمان:

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم حکمت اور اپنی وسیع رحمت کی بنا پر انسانوں کو فضول اور بے مقصد نہیں چھوڑا بلکہ ان کے پاس اپنے رسولوں کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا''رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجة بعد الرسل و کان اللہ عزیزاً حکیما'' (النساء:۴/۱۶۵)۔اللہ تعالیٰ نے ہر امت میں اپنا فرستادہ مبعوث فرمایا:''أن اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت'' (النحل: ۱۶/۳۶)۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''وإن من أمة إلا خلا فیھا نذیر'' (فاطر:۳۵/۲۴)۔

قرآن کا فیصلہ ہے کہ اللہ لوگوں سے حساب اس وقت تک نہ لے گا اور ان کو اس وقت تک سزا نہ دے گا جب تک کہ وہ اپنے پیغمبروں

کو بھیج کر، ان تک اپنا پیغام پہنچا کر اور ان کو ان کے رب کے حوالے سے ان کی منصبی ذمہ داریاں پوری وضاحت سے بتا کر ان پر اپنی حجت نہ پوری کر لے گا: "**وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا**" (الإسراء:۱۷/۱۵)۔

اسی لئے اہل تحقیق علماء کی رائے ہے کہ مختلف غیر مسلم اقوام پر اس وقت تک حجت پوری نہ ہوگی اور اہل کفر اس وقت تک کسی سزا کے مستحق نہ ہوں گے جب تک کہ ان کے پاس اسلام کی دعوت صاف وصریح انداز میں اور اس دین پر غور وفکر اور ریسرچ وتحقیق کی طرف راغب کرنے والے اسلوب میں نہ پہنچ جائے۔ جہاں تک ناقص اور مسخ شدہ تبلیغ کا تعلق ہے تو اس سے کسی سادہ لوح یا اختلاف رائے رکھنے والے شخص پر حجت نہیں پوری ہوتی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوع انسانی پہلے بھی انبیاء کی رسالت کی محتاج رہی ہے اور اب بھی ہے۔ انبیاء اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سب سے پاکیزہ، سب سے باعزت، سب سے زیادہ عقل وحکمت کی دولت سے بہرہ مند ہستیاں ہیں: "**الله أعلم حيث يجعل رسالته**" (الأنعام:۶/۱۲۴)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل تنہا تمام حقائق کی توضیح کے لئے ناکافی ہے بہ طور خاص اس باب میں کہ بندوں کے کون کون سے اعمال اللہ کو محبوب اور پسند ہیں۔ اسی وجہ سے انسان کو ایک معاون کی ضرورت ہوئی جو بہ وقت ضرورت اس کی غلطیوں کی تصحیح اور اس کی بے اعتدالیوں کی اصلاح کر سکے۔ یہ معاون وحی الٰہی ہے، یہ وحی ان امور میں بھی جن تک عقل کی رسائی ممکن ہے، نور علی نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

رسولوں کا فرض منصبی یہ ہے کہ انسانوں کو اللہ کی سیدھی راہ دکھائیں، صراط مستقیم میں بندوں کے وہ تمام اعمال شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔

انبیاء کی ذمہ داری ہے کہ ان اہم مسائل میں جن میں عقلیں بہ مشکل ہی کوئی اجتماعی فیصلہ کر پاتی ہیں، انسانوں کے لئے عدل کی راہ کی نشان دہی کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**لقد أرسلنا رسلنا بالبينات و أنزلنا معهم الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط**" (الحدید:۵۷/۲۵)۔

انبیاء کا ایک فریضہ یہ ہے کہ لوگوں کے باہمی نزاعات واختلافات کا فیصلہ کر کے ان کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل پر آمادہ کریں جسے ایک صاحب ایمان رد نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "**كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين و منذرين و أنزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه**" (البقرۃ:۲/۲۱۳)۔

تاریخ اور انسانی تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام انسانوں کو اپنے سے بلند تر ایک قانونی مرجع کی ضرورت ہے جو ان کو ایسے راستہ کی رہنمائی کر سکے جس میں ان کی فلاح وبہبود ہو، انہیں محض ان کی عقلوں کے سہارے نہ چھوڑ دے، ایسا بہت بار ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے خیر اور شر دونوں ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں مگر پھر ان پر خواہشات، نفسانیت اور شخصی اور وقتی مفادات کا غلبہ ہو جاتا ہے جن کے نتیجہ میں وہ ان قوانین ودساتیر کو درست ٹھہرا لیتے ہیں جو ان کے لیے مفید نہیں بلکہ مضر ہوتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ امریکا میں بعض ریاستوں (ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے ۱۹۲۰ء میں شراب پر پابندی عائد کی پھر اسے ۱۹۳۳ء میں اٹھالیا)۔ نے شراب کے نقصانات واضح ہونے کی بنا پر اسے حرام قرار دینے کی کوشش کی مگر پھر ان پر خواہشات غالب آ گئیں اور انہوں نے اس کے جائز ہونے کے حوالہ سے ایک قانون جاری کیا جس کی بنا پر شراب بنانا، اس کی تشہیر کرنا، اسے پینا اور اس کی تجارت کرنا سب کا سب جائز ٹھہرا۔

اللہ سبحانہ کی حکمت کا تقاضہ ہوا کہ ہر رسول اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوا اور اس کا پیغام ایک متعین دور کے ساتھ مخصوص ہوتا کہ وہ سب سے آخر میں ایک ایسے پیغمبر کو مبعوث فرمائے جو اپنے اپنے زمان ومکان کے ساتھ مخصوص سابقہ شرائع کے بعض احکام کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے

مطابق منسوخ کرے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"بکل جعلنا منکم شرعة و منهاجاً" (المائدہ:۵/۴۸)۔

نبی کبھی سابقہ شریعت پر بھی عمل کرتا ہے جیسا کہ بیشتر انبیاء بنی اسرائیل نے کیا۔

اس کے بعد اللہ کی مشیت ہوئی کہ اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عمومی، دائمی اور ہمہ گیر شریعت کے ساتھ مبعوث فرمائے۔ چنانچہ شریعت محمدی مکان کے اعتبار سے عام ہے، زمان کے اعتبار سے دائمی ہے اور تمام بنی نوع انسان کے احوال وظروف کو محیط ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"وما أرسلناك إلا رحمةً للعالمين" (الأنبیاء:۲۱/۱۰۷)۔"ما كان محمد أبا أحد من رجالكم ولكن رسول الله وخاتم النبيين"(الأحزاب:۳۳/۴۰)۔"ونزلنا عليك الكتاب تبيانا لكل شئ و هدى و رحمة و بشرى للمسلمين" (النحل:۱۶/۸۰)۔

اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ رب انسانیت اپنے ارتقاء کے عروج پر پہنچ چکی ہے اور اس بات کی مستحق ہو چکی ہے کہ اس کے پاس آخری رسول آخری کتاب اور آخری شریعت کے ساتھ بھیجا جائے اور اس شریعت میں وہ تمام اصول ومبادی شامل کردیئے جائیں جو ہر دور اور ہر مقام کے مناسب حال ہوں۔ چنانچہ اس میں ابدیت کے وہ تمام عناصر اور وسعت و لچک کے وہ تمام محرکات ودیعت کردیئے گئے ہیں جن کے ہوتے یہ زمانہ کے ارتقاء کا ساتھ دینے اور ہر بیماری کا علاج خود اسلام کی فارمیسی سے کرنے سے قاصر نہیں رہے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کے مآخذ میں وہ صلاحیت اور کشادگی رکھ دی ہے جو اسے ہر سوال کا جواب دینے اور بغیر کسی تکلیف وتکلف کے ہر مشکل سے چھٹکارا دلانے کے قابل بناتی ہے۔

اسلامی عقیدہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ کی تمام نازل کردہ کتابوں اور اس کے مبعوث کئے گئے تمام رسولوں پر ایمان اس کا ایک رکن ہے،اس کے بغیر ایمان درست ہی نہیں۔"قولوا آمنا بالله وما أنزل إلينا وما أنزل إلى إبراهيم و إسماعيل و إسحاق و يعقوب والأسباط وما أوتي موسى و عيسى و ما أوتي النبيون من ربهم لانفرق بين أحد منهم و نحن له مسلمون" (البقرہ:۲/۱۳۶)۔

یہ عقیدہ تعمیر کرتا ہے نہ کہ تخریب۔ یہ اپنے سے پہلے کے عقائد کی تکمیل، تصحیح اور تصدیق کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے فرمایا: "و أنزلنا إليك الكتاب بالحق مصدقاً لما بين يديه من الكتاب و مهيمناً عليه" (المائدہ:۵/۴۸)۔

عبادات:

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مکلّف بندے پیدا فرمائے تاکہ وہ اپنے خالق اور منعم کی حیثیت سے اس کی بندگی کا حق ادا کرسکیں۔اللہ تعالیٰ منعم اس حیثیت سے ہے کہ اس نے انسانوں کو بڑی بڑی نعمتیں عطا فرمائیں: زندگی کی نعمت، عقل کی نعمت، گویائی کی نعمت، انسانوں کے فائدے کے لئے پوری کائنات کی تسخیر کی نعمت، رسولوں کو مبعوث فرمانے اور ان پر کتابیں نازل فرمانے کی نعمت وہ تمام نعمتیں جن کے زیر سایہ مخلوقات زندہ ہیں، اللہ رب العزت ہی کی عطا کردہ ہیں۔"وما بكم من نعمة فمن الله" (النحل:۱۶/۵۳)۔"و إن تعدوا نعمة الله لاتحصوها" (إبراہیم:۱۴/۳۴،النحل:۱۶/۱۸)

اسی وجہ سے اس عظیم المرتبت رب کا جس نے پیدا کیا اور نک سک سے درست کیا"الذى خلق فسوى" (الأعلی:۸۷/۲)۔حق ہے کہ بندے صرف اسی کی طرف بندگی کے لئے رُخ کریں جو ان کی تخلیق کا واحد مقصد ہے:"و ما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون"

(الذاریات:۵۱/۵۱)۔

عبادات کے چند مقاصد ہیں:

اول: بندے اور رب کے درمیان عبد و معبود کے رشتہ کی تکمیل۔

دوم: بندوں کے درمیان بلکہ تمام مخلوقات کے مابین صفت رحمت کا عروج واستحکام۔

سوم: بندہ اور اس کی خواہشات کے مابین تزکیہ کا ارتقاء۔

ان مقاصد میں سے کوئی ایک بھی دوسرے سے جدا نہیں ہے۔

عبادات میں سے بعض فرض ہیں، بعض نفل ہیں، بعض ظاہر ہیں اور بعض باطن ہیں۔

ظاہری فرض عبادات میں اہم ترین وہ عظیم شعائر ہیں جو اسلام کے بنیادی ارکان اور اس کے مضبوط ستون قرار دیئے گئے ہیں یعنی نماز، زکاۃ، روزہ اور بیت اللہ کا حج۔ جو ان کی فرضیت کا انکار کرے یا ان کا تقدس گھٹائے وہ اسلام کے دائرہ سے خارج ہے۔

ان عبادات میں سے بعض خالص بدنی ہیں جیسے نماز اور روزہ اگر چہ نماز کی بنیاد فعل (کرنے) پر ہے اور روزہ کی بنیاد ترک (چھوڑنے) پر ہے۔ بعض عبادات خالصتاً مالی ہیں جیسے زکاۃ۔ بعض عبادات وہ ہیں جو بدنی بھی ہیں اور مالی بھی جیسے حج اور عمرہ۔ یہ دونوں عبادتیں بیک وقت بدنی بھی ہیں اور مالی بھی۔

بعض عبادات ایسی بھی ہیں جو ان عبادات سے متصل ہیں جیسے نفل نمازیں، نفلی صدقات، نفلی روزے اور نفلی حج۔

بعض دوسری رضا کارانہ عبادات بھی ہیں جیسے تلاوت قرآن، اللہ تعالیٰ کا بہ صورت تسبیح وتحمید، تہلیل، تکبیر، دعاء واستغفار، ذکر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر صلاۃ۔

بعض عبادات باطنی بھی ہیں جن کا دین میں ایک مقام اور اللہ کی نظر میں ایک مرتبہ ہے جیسے اللہ کے حضور اخلاص نیت، اس کی جناب میں توبہ، اس کی ذات سے حیاء، اس کی خشیت، اس پر توکل، اس کی نعمتوں پر شکر، اس کی طرف سے پیش آنے والی آزمائشوں پر صبر، اس کے فیصلوں پر راضی رہنا، اس سے دور اس کے سلسلہ میں دوسروں سے محبت کرنا، اس کی رحمت کا امیدوار رہنا، اس کے عذاب سے ڈرنا اور ہر معاملہ میں اس کا استحضار رکھنا۔

بعض ایسی عبادات بھی ہیں جو شعائر نہیں ہیں۔ ایسی بیش تر عبادات بندوں کے مابین صفت رحمت کو تقویت پہنچانے والی اور تمام مخلوقات جیسے حیوانات، نباتات اور زمین کے ساتھ حسن سلوک کی دعوت دینے والی ہیں جیسے والدین کی اطاعت، صلہ رحمی، پڑوسیوں سے بہتر سلوک، کمزور لوگوں کے ساتھ ہمدردی، مظلوموں کی فریاد رسی، پریشان حال لوگوں کی مشکلات دور کرنا، نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون، معروف کا حکم دینا، منکر سے روکنا، خیر کی دعوت دینا، امور دین میں خیر خواہی، حق، صبر اور ہمدردی کی باہمی تلقین، یتیم کا اعزاز، مسکین کے کھلانے پر لوگوں کو آمادہ کرنا، ظلم اور فساد کا سد باب، برائی کو ہاتھ یا زبان سے مٹانا یا اسے دل میں برا سمجھنا جو ایمان کا کم تر درجہ ہے، اسی طرح ہاتھ سے یا مال سے یا زبان سے جہاد کرنا نیز ہر وہ بھلائی جو ایک مسلمان لوگوں کے لئے کرے خواہ ایک میٹھی مسکراہٹ یا ایک پاکیزہ بول یا راستہ سے کوئی تکلیف دہ چیز ہٹا دینے کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ سب باتیں عبادات میں شامل ہیں۔ کیونکہ عبادات کا اطلاق ان تمام اقوال واعمال پر ہوتا ہے جو اللہ کو پسند اور اس کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہوں، خواہ وہ اعضاء وجوارح سے سرزد ہونے والے اعمال ہوں یا دلوں کی حرکات وسکنات۔

یہاں تک کہ ایک انسان کا اپنی معاش کے لئے جدوجہد کرنا قرب الٰہی کے حصول کا سب سے بہتر ذریعہ ہے بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو، وہ حدود الٰہی کا پابند ہو اور لوگوں کے حقوق کی رعایت کرے۔

بعض عبادات وہ ہیں جو بندہ اور اس کی خواہشات کے باہمی ربط کے حوالہ سے بندہ کے تزکیہ کے عمل کو تقویت بخشتی ہیں۔ ایک شخص کا اپنی شہوانی خواہش پوری کرنا بشرطیکہ جائز ذریعہ اور نیک نیتی سے ہو، اللہ تعالیٰ کی عبادت شمار کیا جائے گا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ''تم میں سے کسی شخص شہوانی خواہش کی تکمیل میں بھی صدقہ ہے۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ایک شخص اپنی ہشوت کی تکمیل کرتا ہے اور اس کو اس پر اجر بھی ملتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: کیا اگر وہ اپنی یہ خواہش کسی حرام ذریعہ سے پوری کرے گا تو اسے گناہ نہ ہوگا؟ اسی طرح اگر وہ اسے ایک حلال ذریعہ سے پورا کرے گا تو اسے اس پر اجر ملے گا (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ۔ اس بیان کا باب کہ لفظ صدقہ ہر قسم کے معروف کے لئے عام ہے۔ راوی حضرت ابوذر ہیں، سنن أبي داوٗد، کتاب الصلاۃ، باب الضحی حدیث نمبر ۱۰۹۳، مسند احمد: کتاب مسند الانصار، باب حدیث أبي ذر الغفاری حدیث نمبر ۲۰۴۹۶)۔

اس طریقہ سے عبادت وسعت اختیار کرکے پوری زندگی اور انسان کے تمام ظاہری اور باطنی اعمال کو اپنے دائرہ میں لے لیتی ہے۔ ایک مسلمان اپنے نقطۂ نظر کی درستگی اور اپنی سچی نیت کے ذریعہ اپنی تمام عادات اور اپنی زندگی کی تمام سرگرمیوں کو عبادات اور اپنے رب کے تقرب میں تبدیل کرسکتا ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو اس کی نیت کا پھل ملے گا'' (متفق علیہ۔ صحیح بخاری۔ کتاب بدء الوحی۔ باب بدء الوحی حدیث نمبر ۱، بروایت حضرت عمر بن الخطاب نیز کتاب الایمان والنذور، باب النیۃ فی الایمان حدیث نمبر ۶۱۹۵۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب قولہ إنما الاعمال بالنیات حدیث نمبر ۳۵۳۰، بروایت حضرت عمر بن الخطاب)۔

اس طرح پوری زمین ایک مسلمان کے لئے محراب اور مسجد میں تبدیل ہوجاتی ہے جس میں وہ اپنی تمام تر سرگرمیوں اور جدوجہد کے ذریعہ اللہ کی بندگی کا عمل کرتا ہے۔ ایک کاشت کار اپنی کاشت کاری میں احسان کا رویہ اختیار کرکے، ایک کاریگر اپنی کاریگری میں احسان کا رویہ اختیار کرکے، ایک تاجر اپنی تجارت میں احسان کا رویہ اختیار کرکے، ایک ملازم اپنی ملازمت میں احسان کا رویہ اختیار کرکے اور ایک طالب علم اپنے مطالعہ میں احسان کا رویہ اختیار کرکے اللہ تعالیٰ کی عبادت کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ اس طرح ہر انسان احسان کا طریقہ اختیار کرکے اپنی مطلوبہ اور مفوضہ عبادت انجام دیتا ہے۔ اس انداز سے زندگی کو عروج حاصل ہوتا ہے، انسان کا ارتقاء ہوتا ہے اور قومیں صحیح معنی میں ترقی کرتی ہیں بشرطیکہ وہ اپنا ہاتھ اللہ کے ہاتھ میں دے دیں۔ اس وقت شیطان ان کے درمیان سے ذلیل وخوار اور شکست خوردہ ہوکر نکل کھڑا ہوتا ہے۔

محاسن اخلاق

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام نے اخلاق پر بہت زور دیا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا: ''و إنک لعلی خلق عظیم'' (القلم: ۶۸/ ۴)۔ اللہ کے رسول ہم سے مخاطب ہوکر اپنے فرض منصبی کا تعین یوں فرماتے ہیں: میں اخلاق کے محاسن وفضائل کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں (مسند احمد، کتاب باقی مسند المکثیر ن، باب باقی المسند السابق حدیث نمبر: ۸۵۹۵، بروایات حضرت ابوہریرہ بہ الفاظ: لأتمم صالح الأخلاق۔ احمد ان الفاظ کی روایت میں منفرد ہیں۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں۔ امام مالک کی الموطأ، کتاب الجامع میں یہ الفاظ ہیں: ''بعثت لأتمم حسن الأخلاق۔ باب أنہ قد بلغہ أن رسول اللہ قال: ''بعثت...... حدیث پر نمبر درج نہیں۔ البانی نے سیوطی کی الجامع الصغیر کے حوالہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے)۔

اسلام نے عبادات سے متعلق فرائض کے بھی جو دراصل ارکان اسلام ہیں، اخلاقی مقاصد متعین کئے ہیں، اسلام چاہتا ہے کہ وہ مقاصد لوگوں کی زندگیوں میں بروئے کار لائے جائیں۔ اگر یہ مقاصد پورے نہ ہوں گے تو عبادات ناقص قرار پائیں گی اور اس قابل نہ ہوگی

کہ اللہ رب العزت ان کو قبول فرمائے، چنانچہ نماز کا مقصد ''تنهى عن الفحشاء والمنكر'' (العنکبوت: ۲۹/ ۴۵)۔ بے حیائی اور بدی سے روکنا ہے، زکاۃ کا مقصد تطہیر وتزکیہ ہے: ''تطهرهم و تزكيهم بها'' (التوبۃ: ۹/ ۱۰۳)۔ روزہ کا مقصد تقوی کی صفت پیدا کرنا ہے: ''لعلهم يتقون'' (البقرۃ: ۲/ ۱۸۷)۔ حج کا مقصد فسق وجدال سے پرہیز کی تعلیم دینا ہے (البقرہ: ۲/ ۱۹۷)۔

اگر ان عبادات سے مذکورہ اخلاقی فوائد حاصل نہ ہوں تو حدیث کہتی ہیں: '' کتنے اسے راتوں کو جاگنے والے ہیں جن کو رت جگے کے سوا کچھ پلے نہیں پڑتا اور کتنے ایسے روزہ دار ہیں جن کو روزہ سے بھوک کے سوا کچھ پلے نہیں پڑتا۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الصیام، باب ما جاء فی الغیبۃ والرفث للصائم، حدیث نمبر ۱۶۸۰، بروایت حضرت ابو ہریرہ، مسند احمد، کتاب مسند المکثرین، باب فی المسند السابق حدیث نمبر ۸۵۰۱، بروایت حضرت ابو ہریرہ، اس روایت کے راوی ثقہ ہیں)۔

اسی طرح حدیث میں ہے: '' جو جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑے، اللہ کو اس کا کھانا پینا چھڑانے کی کوئی ضرورت نہیں'' (صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب من لم یدع قول الزور، حدیث نمبر: ۱۷۷۰، راوی حضرت ابو ہریرہ ہیں۔ سنن الترمذی، کتاب الصوم، باب ما جاء فی الشدید فی الغیبۃ، حدیث نمبر ۶۴۱، بروایت حضرت ابو ہریرہ، امام ترمذی نے اسے حدیث حسن صحیح قرار دیا ہے، سنن أبي داؤد، کتاب الصوم، باب الغیبۃ للصائم، حدیث نمبر ۲۰۱۵، بروایت حضرت ابو ہریرہ)۔

اسلام ان اخلاق فاضلہ کو حقیقی ایمان کی تشکیل کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن اہل ایمان کے درج ذیل اوصاف بیان کرتا ہے: ''**الذين هم فى صلاتهم خاشعون و الذين هم عن اللغو معرضون والذين هم للزكاة فاعلون والذين هم لفروجهم حافظون إلا على أزواجهم أو ما ملكت أيمانهم فإنهم غير ملومين فمن البتغى وراء ذلک فأولئک هم العادون والذين هم لأماناتهم وعهدهم راعون**'' (المؤمنون ۲۳/ ۲-۸)۔

صحیح احادیث کا اس پر بہت زور ہے کہ ایمان اعلیٰ اخلاق واوصاف میں جلوہ گر ہو: '' جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ صلہ رحمی کرے۔ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ پہنچائے...... وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے...... بھلی بات کہے یا خاموش رہے'' (صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب إکرام الضیف، حدیث نمبر ۵۶۷۳، بروایت حضرت ابو ہریرہ، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الحث علی إکرام الضیف، حدیث نمبر ۶۷، بروایت حضرت ابو ہریرہ)۔ '' مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے خون اور اپنے مال کے سلسلہ میں محفوظ ہوں (سنن الترمذی، کتاب الایمان، باب ما جاء فی أن المسلم من سلم المسلمون، حدیث نمبر ۲۵۵۱، بروایت حضرت ابو ہریرہ، سنن النسائی کتاب الایمان، باب صفۃ المؤمن، حدیث نمبر: ۴۹۰۹، بروایت حضرت ابو ہریرہ، مسند الامام احمد، کتاب مسند المکثرین، باب باقی المسند السابق حدیث نمبر: ۸۵۷۵، بروایت حضرت ابو ہریرہ۔ امام ترمذی نے اسے السابق حدیث نمبر ۸۵۷۵، بروایت حضرت ابو ہریرہ۔ امام ترمذی نے اسے حدیث حسن صحیح قرار دیا ہے)۔

احادیث میں فواحش اور رذائل کا ارتکاب کرنے والوں سے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: زنا کا کرنے والا بہ حالت ایمان زنا نہیں کرتا، شراب پینے والا بہ حالت ایمان شراب نہیں پیتا (صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب النہی بغیر إذن صاحبۃ حدیث نمبر: ۲۲۹۵، بروایت حضرت ابو ہریرہ، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی، حدیث نمبر: ۸۶، بروایت حضرت ابو ہریرہ سنن ترمذی، کتاب ابواب الایمان، باب لا یزنی الزانی حدیث نمبر: ۲۷۶۰، بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) '' وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں رکھتا جو خود تو بھر پیٹ کھا کر سوئے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اسے یہ معلوم بھی ہو'' (اس حدیث کی روایت طبرانی نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے (حدیث نمبر ۱۳۰۵۲)۔

اسلام نے ان اخلاق فاضلہ کو اپنی ان بنیادی دینی تعلیمات میں شامل کیا ہے جن کے متعلق قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اوامر و نواہی مروی ہیں۔ لہٰذا اعلیٰ اخلاقی اوصاف اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض میں اور اخلاقی رذائل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممنوع قرار دیئے گئے

حرام امور میں شامل ہیں۔

عدل، احسان، راست بازی، ایمان داری، ایفائے عہد، وعدہ کی تکمیل، مخلوق سے ہمدردی، تنگ دستی، بدحالی اور حالت جنگ میں ثابت قدمی، حیاء، تواضع، ایمان پر فخر، شجاعت، سخاوت، عفت، بردباری، طاقت ہوتے ہوئے عفوودرگزر، غصہ پر قابو، اسی طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک، قرابت داروں پر انفاق، ہم سایہ سے بہتر سلوک، مسکین، یتیم، مسافر اور ملازمین پر شفقت، کم اور کی مدد اور مظلوم کی فریادرسی یہ تمام اخلاقی فضائل ومحاسن دین کے عظیم ترین مامورات میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ان کی تلقین کی ہے اور ان پر عمل کرنے والے نیکوکاروں اور اہل تقوی کو بشارت دی ہے جیسا کہ قرآن کریم کی سورۂ انفال اور سورۂ مومنون کے آغاز میں، سورۂ رعد کے درمیان میں اور سورۂ فرقان کے اخیر میں عبادالرحمٰن کے اوصاف عالیہ کے حوالہ سے نیز سورۂ ذاریات میں اہل احسان واہل تقوی کے مثالی کردار کے ذیل میں اسی طرح سورۂ معارج وغیرہ میں یہ سب تفصیل سے موجود ہیں۔

ان فضائل کے برعکس ظلم وزیادتی، کذب، خیانت، فریب، وعدہ خلافی، سنگ دلی، بے حیائی، غرور وتکبر، غیبت، چغلخوری، جھوٹی گواہی، ظاہری وباطنی فواحش کا ارتکاب، منشیات کا استعمال، والدین کی نافرمانی، رشتوں کا پاس ولحاظ نہ رکھنا، پڑوسی کو ایذا پہنچانا، یتیم کی حق تلفی، مسکین اور مسافر کے ساتھ بے رحمی، حق، صبر اور ہمدردی کی باہمی تلقین سے گریز، بدی کو پھیلنے کے لئے آزاد چھوڑ دینا، ظالم کی نکیر اور اس کا ہاتھ پکڑنے سے ڈرا۔ یہ اور ان جیسے دوسرے تمام اخلاقی معائب اسلام میں محرمات اور منکرات میں شمار ہوتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض تو کبیرہ گناہوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ درج ذیل نصوص اس کی شہادت دیتے ہیں:

"أرأیت الذی یکذب بالدین فذلک الذی یدع الیتیم ولایحض علی طعام المسکین" (الماعون: ۱۰۷-۱-۳)۔

"جس کے دل میں ذہر برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا" (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ، حدیث نمبر: ۱۳۱، راوی حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں۔ سنن الترمذی، کتاب البر والصلۃ عن رسول اللہؐ باب ماجاء فی الکبر، حدیث نمبر: ۱۹۲۲، سنن ابن ماجہ، کتاب المقدمۃ، باب فی الایمان، حدیث نمبر، ۵۸، بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)۔

"ایک انسان کے برے ہونے کے لئے اتنا کافی ہے ک وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے" (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ، حدیث نمبر: ۴۶۵۰، بروایت حضرت ابوہریرہ، سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الغیبۃ، حدیث نمبر ۴۲۳۸، راوی حضرت ابوہریرہ ہیں، سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب البغی، حدیث نمبر ۴۲۰۳، بروایت حضرت ابوہریرہ)۔ حدیث قدسی ہے: "میں تمام بے نیاز ہستیوں سے بڑھ کر شرک سے بے نیاز ہوں، جو کوئی ایسا عمل کرے جس میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کرے تو اس کا پورا کا پورا عمل اس کے ٹھہرائے ہوئے شریک ہی کے لئے ہوگا۔ اے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے اور اسے تم پر بھی حرام ٹھہرایا ہے، اس لئے تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ ولاآداب، باب تحریم الظلم، حدیث نمبر: ۴۶۷۴، بروایت حضرت ابوذر مسند احمد، کتاب مسند الأنصار، باب حدیث أبی ذر الغفاری، حدیث نمبر ۲۰۴۵۱)۔

"باہمی رشتوں کا بگاڑ انسان کو مونڈ دیتا ہے (سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، حدیث نمبر: ۲۴۳۳، بروایت حضرت ابوالدرداء، امام نے اس حدیث صحیح قرار دیا ہے، سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی اصلاح ذات البین، حدیث نمبر ۴۲۷۳، بروایت حضرت ابوہریرہ، مسند احمد، کتاب من مسند القبائل، باب من حدیث أبی الدرداء، حدیث نمبر ۲۶۲۳۶)۔

"جھوٹی گواہی اللہ رب العزت کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کے برابر ہے" (سنن الترمذی، کتاب الشہادات عن رسول اللہ، باب ماجاء فی شہادۃ الزور حدیث نمبر: ۲۲۲۳، امام ترمذی کہتے ہیں: یہ میرے نزدیک صحیح ترین روایت ہے، سنن ابی داؤد، کتاب الأقضیۃ، باب فی شہادۃ الزور، حدیث نمبر ۳۱۲۴، سنن ابن

ماجہ، کتاب الأحکام، باب شہادۃ الزور، حدیث نمبر: ۲۳۶۳، راوی خریم ابن فاتل ہیں، مسند الامام احمد، کتاب مسند الشامیین، باب حدیث أیمن بن خریم حدیث نمبر: ۱۶۹۴۳ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)۔

''ایک عورت صرف اس وجہ سے جہنم کی سزا کی مستحق ہوگئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ بلی مرگئی'' (صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب خمس من الدواب فواسق، حدیث نمبر: ۳۰۷۱، بروایت حضرت ابن عمر، صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم قتل الھرۃ، حدیث نمبر: ۴۱۶۰)۔

''کیا میں تمہیں سب سے سنگین کبیرہ گناہ نہ بتاؤں؟ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی، پھر آپؐ نے فرمایا: آگاہ ہوجاؤ! اور جھوٹ بولنا اور جھوٹی شہادت دینا بھی'' (صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب عقوق الوالدین، حدیث نمبر: ۱۲۶، بروایت حضرت ابوبکرہ)۔

''کاٹنے والا جنت میں نہیں جائے گا'' (صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب إثم القاطع، حدیث نمبر: ۵۵۲۵، بروایت حضرت جبیر بن مطعم، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والأدب باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا، حدیث نمبر: ۴۶۳۶، بروایت حضرت جبیر)۔

اس حدیث میں راجح ترین قول کے مطابق کاٹنے والے سے مراد رشتوں کو توڑنے والا ہے، اس کا ایک مفہوم ڈاکو بھی بتایا گیا ہے۔

''جنت میں چغل خور نہیں داخل ہوگا'' (صحیح بخاری، کتاب الأدب باب ما یکرہ من النمیمۃ، حدیث نمبر: ۵۵۹۶، بروایت حضرت حذیفہ، صحیح مسلم، کتاب الایمان باب غلظ تحریم النمیمۃ حدیث نمبر: ۱۵۲، بروایت حضرت حذیفہ)۔

اسلامی اخلاق ہر شعبہ سے مربوط ہیں۔ زندگی کا کوئی میدان ان سے علاحدہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسری تہذیبوں کے فلسفۂ علم اور اخلاق، معاشیات اور اخلاق، سیاست اور اخلاق نیز جنگ اور اخلاق کے درمیان فرق کرتے ہیں، اسلام ان تمام امور کو بہت قوت کے ساتھ اخلاق سے مربوط کرتا ہے۔

اسلام اس نظریہ کو سند جواز عطا نہیں کرتا کہ ''مقصد ذریعہ کو جائز بناتا ہے'' نہ اسلام اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے پست اور غیر اخلاقی ذرائع کے استعمال کو جائز ٹھہراتا ہے۔ اسلام پاکیزہ ذرائع سے بلند مقاصد تک پہنچتا ہے۔ وہ کسی حال میں باطل کے راستہ سے حق تک پہنچنے کا روادار نہیں کہ رشوت، سود اور ناجائز ذخیرہ اندوزی کے مال سے مسجد کی تعمیر کی اجازت دے۔ ''اللہ تعالیٰ پاکباز ہے اور وہ صرف پاکیزہ مال ہی قبول فرماتا ہے'' (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب الطیب وتربیتھا، حدیث نمبر: ۱۶۸۶، بروایت حضرت ابوہریرہ سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ باب من سورۃ البقرۃ)۔

امت مسلمہ کا اتحاد

۱- ہمارا ایمان ہے کہ جزئیات دین میں خواہ وہ اعتقادی ہوں یا عملی، بلاشبہ اختلاف موجود ہے اور اس میں کوئی شر اور نقصان نہیں بشرطیکہ اختلاف کے آداب ملحوظ رکھے جائیں۔ ایسا اختلاف ایک ضرورت، ایک رحمت اور وسعت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا تقاضہ ہوا کہ دین کے فہم میں انسانی عقلوں میں باہم اختلاف واقع ہو۔ یہ اختلاف ایک لسانی ضرورت سے وجود میں آتا ہے۔ کیونکہ اس دین کے مصادر وماَ خذ جس زبان میں خطاب کرتے ہیں، اس میں حقیقت بھی ہے، مجاز بھی، صریح بھی ہے، کنایہ بھی، عام بھی ہے خاص بھی، مطلق بھی ہے، مقید بھی وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث کی تفہیم میں ذہنوں کے درمیان تفاوت ہوتا ہے جو ایک انسانی فطرت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکرر اشیاء کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے بلکہ ہر انسان کی ایک سوچ ہے۔ اس کے محرکات ہیں اور اس کی ایک علاحدہ قوت ارادی ہے۔ انسانوں میں غبی بھی ہیں، ذہین بھی ہیں اور عبقری بھی۔ اسی طرح ان میں سہولت پسند اور روادار بھی ہیں جو آسانی کی طرف رجحان رکھتے ہیں اور ان میں شدت پسند اور سخت مزاج بھی ہیں جو تنگی اور شدت پسندی کا میلان رکھتے ہیں۔

یہ اختلاف امت کے لئے ایک رحمت ہے۔ اگر شریعت میں ایک ہی رائے پائی جاتی تو امت کو تنگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس صورت میں یہ شریعت لوگوں کے ایک مخصوص طبقہ ہی تک محدود رہتی اور دوسرے لوگوں کو مشکل حالات سے دوچار ہونا پڑتا۔

اس اختلاف میں فقہ کا ارتقاء شریعت کی زرخیزی اور امت کے لئے توسع کا راز پنہاں ہے۔ ایک رائے ایک وقت کے لئے مناسب ہوتی ہے اور دوسرے وقت کے لئے مناسب نہیں ہوتی۔ ایک رائے ایک مسلک کے لئے مناسب ہوتی ہے جبکہ وہی رائے دوسرے ملک کے مناسب حال نہیں ہوتی۔ کوئی قول ایک صورت حال کے موافق ہوتا ہے جب کہ وہی قول دوسری صورت حال سے موافقت نہیں رکھتا۔ متعدد اقوال وآراء کی صورت میں قوی تر دلیل اور درست ترین موقف پر مبنی نیز مقاصد شریعت اور مصالح خلق کی بہتر طور پر تکمیل کرنے والے قول کو ترجیح دینے کے لئے انتخاب واختیار کا میدان وسیع ہوتا ہے۔

اسی لئے اختلاف کے ازالہ، مسالک کے خاتمہ اور تمام لوگوں کو ایک ہی رائے پر جمع کرنے کی کوشش ناممکن اور غیر مفید ثابت ہو چکی ہے، ہم یہ منظر دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح امت مسلمہ نے مختلف مکاتب فکر، متعدد مسالک فقہ اور مختلف فرقوں کو قلبی وسعت کے ساتھ قبول کیا ہے۔

اس لئے ہماری ذمہ داری ہے کہ اختلاف سے پریشانہ ہوں بلکہ اس کی کوشش کریں کہ یہ اختلاف کش مکش اور تضاد کے بجائے ارتقاء اور تنوع میں تبدیل ہو جائے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم سب آداب اختلاف کے پابند ہوں اور ''فقہ الاختلاف'' کو یا دور جدید کی ہماری علماء برادری کے بعض افراد کے بقول ''فقہ الائتلاف'' (اتحاد کی فقہ) کو اس طور پر متعارف کرائیں کہ ہماری آراء میں اختلاف ہو، ہمارے دلوں میں اختلاف نہ ہو۔ اسی طرح ہم امت کے اہم مسائل کے مقابلہ کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح باہم متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ہم ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں۔ ہم گھات لگائے کسی دشمن کے لئے کوئی ایسا شگاف نہ چھوڑیں جس سے داخل ہو کر وہ ہماری صفوں میں انتشار پیدا کردے اور ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کردے۔ یہ بات اس نازک صورت حال میں بہ طور خاص توجہ کے قابل ہے جب امت مسلمہ کے خلاف بدترین سازش رچی جارہی ہے اور اس کا دین خطرہ میں ہے۔ امت کے دشمن چاہتے ہیں کہ اس کی ثقافت، اس کی تفکیری قوت، اس کے تشخص یہاں تک کہ اس کی دینی تعلیم پر حملہ کرکے اسے پوری طرح بدل دیا جائے۔ وہ دینی تعلیم میں مداخلت کرکے ایک ایسی امت کی تشکیل چاہتے ہیں جس کا کوئی پیغام نہ ہو، جو ان کے منصوبوں کو من وعن قبول کرے اور ان کے مطالبات پر دل وجان سے عمل کرے۔

اسلامی اتحاد ہر زمانہ میں مطلوب رہا ہے مگر اس دور میں اس کی ضرورت ہر زمانہ سے زیادہ ہے۔ کیونکہ اس وقت امت کو اگر خطرہ سے بچایا جاسکتا ہے تو صرف اور صرف باہمی تعاون اور آپسی اتحاد کے ذریعہ۔

اس وحدت کا آغاز اہل علم سے ہونا چاہئے جو احکام شرع کے حوالے سے امت کے عوام کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کی بنیاد یہ اصول ہونا چاہئے: ''ہم مشترک امور میں ایک دوسرے کا تعاون کریں گے۔ ور مختلف فیہ امور میں ایک دوسرے سے مذاکرات کریں گے''۔

ہمارا مطلوب وہ بامقصد اور تعمیری مذاکرات ہیں جن کے ذریعہ حق کا اظہار ہو اور خیر میں باہمی تعاون کا دروازہ کھلے۔ ان مذاکرات کا آغاز بھائی چارہ اور محبت کی فضا میں ہو۔ ان کے لئے علم اور معروضیت کا اسلوب اختیار کیا جائے اور ان میں شور وغوغا سے ہر طرح گریز کیا جائے۔

۲- ہمارا ایمان ہے کہ ایک مسلمان سے دوسرے مسلمان کے تعلق کی بنیاد حسن ظن اور امکان کی حد تک اس کی شبیہ کو بہتر بنانے پر ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان بغیر کسی قطعی دلیل کے کسی کو گنہگار یا فاسق یا بدعتی قرار نہیں دے سکتا۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ سب سے

بدترین سلوک یہ ہے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی واضح ثبوت یعنی شک اور بحث سے پاک قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ نص شرعی کے بغیر سنگین کفر کا الزام عائد کرے اور اسے ملت اسلامیہ سے خارج قرار دے۔ جہاں تک اس نص کا تعلق ہے جس میں بحث اور قیل وقال کی گنجائش ہے تو اس کی تاویل ایک مسلمان کے مصالح کو سامنے رکھ کر کی جائے گی اگر کسی کا مسلمان ہونا یقین کے ساتھ ثابت ہے تو یہ یقین شک کی بنیاد پر زائل نہیں ہوسکتا۔

ایسی متواتر صحیح احادیث وارد ہیں جن میں مسلمانوں کو باہمی تکفیر کے انجام بد سے خبردار کیا گیا ہے۔لہٰذا اس صورت حال کو اتنی معمولی حیثیت دے دینا کہ ہر فرقہ اپنے مخالف کی تکفیر کو جائز قرار دینے لگے کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔

''جو شخص کسی کی طرف کفر منسوب کرے یا اسے اللہ کا دشمن قرار دے اس میں یہ بات نہ ہو تو یہ الزام اس کے قائل پر لوٹ آئے گا (صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب: من قال لأخیہ یا کافر حدیث نمبر ۶۱، بروایت حضرت ابوذر، مسند احمد، کتاب مسند الانصار، باب حدیث أبی ذر الغفاری، حیدث نمبر: ۲۰۴۹۲)۔

''اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو کہے: اے کافر! تو اس میں سے کوئی ایک اس کا مصداق ہوگا۔اب اگر یہ انتساب دست ہے تب تو ٹھیک ہے ورنہ یہ کہنے والے کی طرف لوٹ جائے گا'' (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من کفر أخاہ بغیر تأویل، حدیث نمبر: ۵۶۳۸، صحیح مسلم کتاب الایمان، باب بیان حال ایمان من قال لأخیہ المسلم یا کافر، حدیث نمبر ۹۲، بہ روایت حضرت ابن عمر)۔

لہٰذا کسی کو کافر قرار دینا ایک دینی، علمی اور سماجی غلطی ہے، کیونکہ اس کے نتیجہ میں امت واحدہ کا افتراق ہوگا اور وہ خطرہ پیش آجائے گا جس سے اللہ کے رسولؐ نے خبردار کیا تھا: ''میرے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو'' (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الانصات العلماء، حدیث نمبر: ۱۱۸، بہ روایت حضرت جدیر، صحیح مسلم، کتاب الایمان باب بیان مغی قول النبیؐ: لاترجعوا بعدی کفاراً، حدیث نمبر ۹۸، بہ روایت حضرت جریر)۔

اگر تکفیر اپنے دلائل کی بنیاد پر جائز ہوگی بھی تو اس کے مخاطب انواع ہوں گے نہ کہ اشخاص، لہٰذا کہا جائے گا کہ ''جو فلاں فلاں بات کا قائل ہو وہ کافر'' جو ایسا ایسا کرے وہ کافر'' جو فلاں بات کا انکار کرے وہ کافر''......کسی متعین شخص کے بارے میں ''یہ کہنا کہ وہ کافر ہے'' صرف اسی وقت درست ہوگا جب اس کا سامنا کیا جائے اور اس کے متعلق اس سطح پر تحقیق وتفتیش کرلی جائے کہ اب اس میں کوئی شبہ باقی نہ رہ جائے۔ اس معیار کی تحقیق وتفتیش صرف عدلیہ ہی کرسکتی ہے۔

اسی لئے ہمارا موقف ہے کہ امت کے عام افراد کو کسی شخص کے بارے میں ارتداد کا حکم لگانے کا حق دینا پھر اس شخص کے متعلق سزا کے استحقاق کا فیصلہ کرنا پھر تعین کے ساتھ یہ طے کرنا کہ اس کی سزا قتل ہی ہے کچھ اور نئی، پھر بے رحمی کے ساتھ اسے نافذ کردینا، لوگوں کے خون، مال اور ان کی عزت وآبرو کے حوالے سے شدید خطرات کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ایک عام شخص کو، جس کے پاس نہ اہل فتوی جیسا علم ہو، نہ اہل قضاء جیسی حکمت اور نہ منتظمین جیسا منصب، تینوں اختیارات بیک وقت سپرد کردیئے جائیں، وہی فتوی بھی دے بہ الفاظ دیگر الزام بھی عائد کرے، وہی فیصلہ بھی صادر کرے اور وہی اس فیصلہ کو نافذ بھی کرے، یعنی مفتی، مدعی، قاضی اور پولیس سب ایک ہی ذات میں جمع ہوجائیں۔

۳- ہمارا ایمان ہے کہ تمام اہل قبلہ ہر قسم کے اختلافات کے باوجود ایک ہیں اور تمام مسلمان خواہ وہ کہیں بھی ہوں، اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین، محمدؐ کو اپنا نبی اور رسول نیز قرآن کو اپنا امام اور منہاج تسلیم کرلینے کے بعد ایک امت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''**إن هــــذه أمتكم أمة واحدة و أنا ربكم فاعبدون**'' (الأنبیاء ۲۱/۹۲)۔

تمام اہل اسلام میں وحدت عقیدہ، وحدت شریعت اور وحدت مقصد کی بناء پر ایمانی اخوت قدر مشترک ہے۔اسلام اس اخوت کے

لئے نصرت، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کے لحاظ وخیال کے باب میں متعین حقوق تسلیم کرتا ہے۔ ’’ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس کی مدد سے دست بردار ہوتا ہے‘‘ (صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، باب یمین الرجل لصاحبہ حدیث نمبر: ۶۹۵۱، بہ روایت حضرت ابن عمر، صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم الظلم، حدیث نمبر ۶۷۷۴، بہ روایت حضرت ابن عمر)

’’تمام اہل اسلام مساوی ہیں۔ میں ان کا قریب ترین ان کو اپنی پناہ میں رکھتا ہے، ان میں کا دور کا فر (ان کو قید سے چھڑاتا ہے اور یہ سب کے سب اپنے علاوہ کے مقابلہ میں ایک طاقت ہیں‘‘ (سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، باب فی السریۃ علی أہل العسکر حدیث نمبر: ۲۷۵۱، بہ روایت حضرت ابن عمر، سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات، باب: المسلمون تتکافأ دماؤہم، حدیث نمبر: ۲۶۸۳، بہ روایت حضرت ابن عباس، مسند احمد، کتاب مسند المکثرین، باب مسند عبداللہ بن عمرو بن العاص، حدیث نمبر ۶۵۰۶، بہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)۔

اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب سے پسندیدہ عمل مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے، ان کے آپس کے تعلقات کو درست کرانے، ان کے مختلف فرقوں اور ان کی مختلف جماعتوں کے درمیان اختلافات کے اسباب کے ازالہ کے لئے کوشش کرنا ہے۔ ’’اِنما المؤمنون اِخوۃ فاصلحوا بین أخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون‘‘ (الحجرات: ۱۰/۴۹)۔ حدیث میں ہے: کیا میں تمہیں نماز، روزہ اور صدقہ سے افضل عمل نہ بتاؤں؟ لوگوں نے کہا: کیوں نہیں: آپؐ نے فرمایا: ’’آپس کے اختلافات کی درستگی، کیونکہ باہمی تعلقات کی خرابی انسان کو مونڈ دیتی ہے‘‘ (سنن الترمذی، کتاب صلۃ القیامۃ والرقائق، باب منہ، حدیث نمبر: ۲۵۰۹، امام ترمذی نے اسے حدیث صحیح قرار دیا ہے، راوی حضرت ابوالدرداء ہیں۔ مسند احمد، کتاب مسند القبائل، باب من حدیث أبی الدرداء حدیث نمبر: ۲۶۲۳۶، بہ روایت حضرت ابوالدرداء)۔

تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان میں ایک عقیدہ، ایک قبلہ، ایک کتاب، ایک رسول اور ایک شریعت پر ایمان قدر مشترک ہے۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ اپنے اتحاد کا شیرازہ بکھیرنے والے تمام اسباب ومحرکات کا ازالہ کریں جیسے نسلی اور علاقائی تعصّبات سے متاثر ہونا، درآمد شدہ نظام فکر اور تصورات کی محکومیت، خواہ وہ دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہوں یا بائیں بازو سے، مشرق یا مغرب کی امت مخالف وفاداریوں کی گود میں جا کر گرنا، خواہشات، اور نفوس پر مسلط انا کی پیروی جس کے زیر اثر حقیر مفادات اور عارضی فوائد کے لئے امت کے بڑے بڑے مصالح کو پیروں تلے روند دیا جاتا ہے۔

اسی طرح افراد امت کی ذمہ داری ہے کہ موجودہ اسلامی اتحاد کو گفتگو کے مرحلہ سے عمل کے مرحلہ میں لائیں، اس کو مستحکم کریں اور اس کے دائرہ کو وسیع کریں تا کہ وہ ہمارے موجودہ دور کے اتحاد یا انضمام کی طرح جس میں چھوٹا بڑے کے زیر سایہ ہی رہ سکتا ہے اور جس میں صرف بڑے ممالک یا طاقتور بلاک ہی کامیاب ہو سکتے ہیں، کوئی سیاسی شکل اختیار کر سکے۔ ہماری امت اگر رب کی پکار پر لبیک کہے تو ایک بڑا ابلاک بننے کی زیادہ مستحق ہے: ”واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرقوا “ (آل عمران ۱۰۳/۳)۔ ”ولا تكونوا كالذين تفرقوا واختلفوا من بعد ماجائهم البينات“ (آل عمران: ۱۰۵/۳)۔ ”ولا تنازعوا فتفشلوا و تذهب ريحكم“ (الانفال: ۴۶/۸)۔

تمام مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ امت مسلمہ کے بلند ترین مصالح ومقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسی طرح امت کی تمام عسکری، اقتصادی اور بشری ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ’’اسلامی خطۂ ارض‘‘ کو اس کے غصب کرنے والوں کے قبضے سے چھڑائیں۔ اس راہ میں ان کی کوشش اور تگ ودو جہاد فی سبیل اللہ کی افضل صورت ہے۔ اگر کوئی شخص تنہا حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور اپنے ملک کو آزاد نہ کرا سکے تو تمام اہل اسلام کا فرض ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کی مدد کریں۔

اس دور میں مسلمانوں کی طرف سے جاری جہاد میں فلسطین کا ایک خاص مقام ہے۔ یہ نبوتوں کی سرزمین ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کی معراج کا مرکز ہے۔ یہ مسجد اقصیٰ کا ملک ہے۔ یہ ہر مسلمان کا مسئلہ ہے۔ لہٰذا پوری امت مسلمہ کا فرض ہے کہ تمام ضروری وسائل سے اہل فلسطین کا تعاون کرے تا کہ ان کا غصب کردہ ملک آزاد ہو، فلسطینی قوم دوبارہ اپنا حق حاصل کر سکے اور اپنے ملک میں اپنی آزاد حکومت قائم کر سکے۔

اسلام کے معصوم مآخذ (قرآن وسنت)

۱- ہمارا ایمان ہے کہ اسلامی عقیدہ، اسلامی شریعت، اسلامی اخلاق و اقدار اور اسلامی تصورات و معیارات کا اولین ماخذ صرف قرآن کریم ہے۔ یہ عصمت (حفاظت) سے متصف وہ ماخذ ہے جس کے نہ آگے سے اس میں باطل آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔ یہ تمام اصولوں کی بنیاد اور تمام مصادر کا منبع ہے۔ کیونکہ صرف اسی ایک ماخذ ہی کے ذریعہ دیگر تمام مآخذ کا قابل استدلال ہونا ثابت ہوتا ہے یہاں تک کہ سنت کی حجیت بھی قرآن ہی کے ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

شہادتِ خدا ورسول کا پابند کسی بھی مسلک اور کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھنے والا کوئی مسلمان ایسا نہیں پایا جاتا جو کامل نص قرآنی کی قطعیت، اس کے انضباط، نقص یا اضافہ کے ذریعہ ہر طرح کی تحریف سے اس کے تحفظ اور اس کی حجیت میں اختلاف کرتا ہو۔ اس باب میں سنی، جعفری، زیدی اور اباضی سب کے سب ایک ہیں۔

قرآن تمام اہل اسلام کی کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بہ طور خاص واضح، آسان اور محفوظ بنایا ہے: "**وأنزلنا إليكم نورا مبينا**" (النساء:۴/۱۷۴)، "**ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر**" (القمر:۵۴/۱۷)، "**إنا نحن نزلنا الذكر و إنا له لحافظون**" (الحجر:۱۵/۹)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے اور اسے ایک ایسے حکم (فیصلہ، قانون) کی حیثیت عطا فرمائی ہے جس کی زبان عربی ہے۔ لہٰذا وہ زبان کے اعتبار سے تو عربی ہے مگر اپنے مندرجات اور نظریہ کے اعتبار سے عالمگیر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**تبارك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيرا**" (الفرقان:۲۵/۱)۔ اس لیے تمام اہل اسلام کا فرض ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کریں تا کہ بندگان خدا تک خدا کا پیغام پہنچ سکے، ان پر حجت قائم کی جسکے، ملت اسلامیہ تبلیغ دین میں کوتاہی کے الزام سے بری ہو سکے اور دنیا کے سامنے اسلامی پیغام کی عالم گیریت ثابت کر سکے۔

۲- قرآن کے بعد سنت صحیحہ ہی اسلام کا دوسرا ماخذ ہے۔ یہ ماخذ دین تمام صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ذریعہ مستند طریقوں سے ہم تک پہنچا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر ایک فریضہ لوگوں کے لئے قرآن کی تشریح وتوضیح کرنے کا بھی عائد کیا ہے: "**وأنزلنا إليك الذكر لتبين للناس ما نزل إليهم ولعلهم يتفكرون**" (النحل:۱۶/۴۴)۔ لہٰذا قرآن سارے عالم کے لئے الٰہی پیغام ہدایت کا نمائندہ ہے اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اقوال، افعال اور تقریرات کی نبوی اور عوامی تشریح وتوضیح کی نمائندہ ہے۔ سنت کبھی قرآن کے اجمالی بیان کی تفصیل کرتی ہے، کبھی اس کے عام کی تخصیص کرتی ہے اور کبھی اس کے مطلق کی تقیید کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے، کیونکہ رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا۔ لہٰذا رسول کی اطاعت بھی اللہ کی ہی کی اطاعت کا ایک جز ہے۔ جیسا اللہ کا ارشاد ہے: "**من يطع الرسول فقد أطاع الله**" (النساء:۴/۸۰)۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول کی اطاعت کو متصلاً بیان فرماتے ہوئے ان ہی دونوں طاعات پر ہدایت اور محبت الٰہی کو موقوف ٹھہرایا ہے، چنانچہ ارشاد ہوا: "**قل أطيعوا الله و أطيعوا الرسول**

فإن تولوا فإنما عليه ما حمل و عليكم ما حملتم و إن تطيعوه تهتدوا" (النور: ۲۴/ ۵۴)۔"**قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم**" (آل عمران: ۳/ ۳۱)۔

سنت کے بغیر قرآن کی جامع اور صحیح تفہیم ممکن نہیں ہے، خواہ یہ سنت قولی ہو جیسا کہ بیش تر سنن کی صورت حال ہے یا سنت عملی جیسا کہ نماز پنج گانہ اور مناسک حج کے بیان سے متعلق سنن کا معاملہ ہے۔ نماز اور حج سے متعلق تمام عملی سنن قطعی تواتر سے ثابت ہیں۔

اسی طرح سنت کو قرآن سے جدا کر کے بہتر طور پر نہیں سمجھا جا سکتا، لہٰذا سنت کو قرآن کے دائرہ اور اس کی روشنی ہی میں سمجھنا لازم ہے، کیونکہ متن اور شرح میں تضاد جائز نہیں۔

اسی طرح سنت بہ حیثیت شارح و تابع قرآن میں تمام اسلامی مسالک و مکاتب فکر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ قرآن و سنت دونوں کی تفہیم نزول قرآن اور ورود احادیث کی زبان کے دائرہ میں اور ان قواعد و مبادی کے مطابق ہو جن کی اصل و اساس کی تلاش و تحقیق ثقہ علماء اور بہ طور خاص اصول فقہ کے ماہرین نے کی ہے۔ ان میں سے بیش تر قواعد پر سب کا اتفاق ہے اور بہت ہی کم ایسے اصول و قواعد ہیں جن میں ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا ہے۔

۳- شریعت کے دیگر مآخذ جیسے اجماع، قیاس، عقل، استصلاح، استحسان عرف، شرائع سابقہ اور استصحاب ان سب کی حجیت بھی اسلام کے دونوں اساسی مصادر قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ و مستفاد ہے۔

شریعت، فقہ اور اجتہاد:

۱- ہمارا ایمان ہے کہ اسلامی شریعت ہی وہ وحی الٰہی ہے جو قرآن کریم اور صحیح سنت نبوی کی صورت میں ہمارے درمیان موجود ہے۔ جہاں تک فقہ اسلامی کا تعلق ہے تو یہ اسلامی ذہن کی وہ تخلیق ہے جو قرآن و سنت کی تفہیم اور ان دونوں مصادر سے عملی احکام کے استنباط کے باب میں کئے گئے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا شریعت وحی ربانی ہے اور فقہ ایک انسانی کاوش۔

لیکن فقہی اجتہاد، تفکیر اور استنباط کو چند ایسے شرعی، عقلی اور لغوی معیارات سے منضبط کیا جاتا ہے جن کی پابندی ایک مسلمان فقیہ کے لئے لازم ہے۔ مسلما اپنے تخلیق کردہ ایک ایسے علم میں منفرد ہیں جو امت مسلمہ کے اسلامی اور علمی ورثہ میں ایک قابل فخر کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ "اصول فقہ" کا علم ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ منصوص اور غیر منصوص تمام امور و احوال منضبط کئے جاتے ہیں۔ اس فن کے ضوابط کی پابندی مسلمان فقہاء نے اس وقت بھی کی جب کہ ابھی منہجی طرز پر "علم اصول فقہ" کی تدوین نہیں ہوئی تھی اور نہ اس علم کی مخصوص اصطلاحات و تعبیرات کی تشکیل ہوئی تھی۔ اصول فقہ کے ضوابط کی پابندی میں تمام فقہاء ایک درجہ میں ہیں، خواہ ان کا تعلق اہل الحدیث مکتب فکر سے ہو یا اہل الرائے مکتب فکر سے۔

ہمارے لئے یہ جاننا اہم ہے کہ شریعت فضا میں معلق صورت میں نہیں پائی جاتی بلکہ وہ بہ حیثیت مجموعی پوری فقہ میں موجود ہے۔ فقہ کا وہ حصہ بھی جو اجماعی ہے اور وہ حصہ بھی جو مختلف فیہ ہے، اسی طرح اس کا وہ باب بھی جو وحی سے ثابت ہے اور وہ باب بھی جو اجتہاد کی بناد پر ثابت ہے، (بشرطیکہ اجتہاد اہلیت اجتہاد رکھنے والی شخصیت کی طرف سے محل اجتہاد میں ہو) سب کے سب شریعت میں شامل ہیں یا شریعت ان میں شامل ہے۔

جو لوگ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم فقہ اسلامی سے دست بردار ہو جائیں وہ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ ہم پوری شریعت کو اپنی زندگی

سے بے دخل کر دیں، کیونکہ اگر شریعت کا کہیں وجود ہے تو اسی فقہ کے اندرون میں ہے۔

البتہ ہم سے اس بات کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس فقہ کی چھان پھٹک کریں اور اس کے احکام کے دوام اور تغیر کی چھاپ کے حوالے سے امتیاز کریں یعنی ہم فقہ کے ان احکام کو الگ کر سکتے ہیں جو اپنے زمان ومکان کے ساتھ مخصوص تھے اور احوال وظروف کی تبدیلی کی وجہ سے آج کے دور سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ایسے ہی احکام کے بارے میں کہا گیا ہے: ''لاینکر تغیر الأحکام تغیر الأزمان'' (زمانہ کی تبدیلی کی وجہ سے احکام میں تبدیلی کوئی معیوب بات نہیں)۔ ''مجلۃ الأحکام العدلیۃ'' نے بھی اپنی ایک دفعہ میں اس کی صراحت کی ہے۔

۲- ہم ''عالمی اتحاد برائے علماء اسلام'' میں اعتدال پسند فقہی اسکول کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ اسکول جزئی نصوص کو کلی مقاصد کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی عداوت یا جنگ برپا نہیں کرتا۔ یہ اسکول حکم جاری کرنے سے پہلے نص کے مقصد کی تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح یہ اسکول نص کو اس کے سیاق، اس کے متعلقات اور اس کے اسباب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اسکول قطعیت کے ساتھ ثابت شدہ مقصد اور تغیر پذیر ذریعہ کے درمیان امتیاز کرتا ہے، اسی طرح شریعت کے مسلمات اور موجودہ دور کے تغیرات کو حکمت کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ اسکول عبادات کے ابواب اور معاملات کے ابواب میں ہمیشہ فرق کرتا ہے۔ کیونکہ پہلے باب میں اصل ممانعت اور پابندی ہے الا یہ کہ شرع کسی چیز کی اجازت دے، ایسا اس لئے ہے تاکہ لوگ شریعت سازی کر کے دین میں وہ امور شامل نہ کر دیں جن کی اجازت اللہ نے نہیں دی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے باب میں اصل اجازت اور جواز ہے الا یہ کہ شرع کسی چیز کے حرام ہونے کی صراحت کر دے۔

اسی طرح عبادات کے باب میں اصل یہ ہے کہ نص سے تمسک کیا جائے اور علل ومعانی پر نظر نہ کی جائے جب کہ عادا اور معاملات میں اصل یہ ہے کہ علل ومعانی اور مقاصد ہی کو مرکز توجہ بنایا جائے۔

ہمارا ایمان اس قول ماثور پر ہے جسے امت میں قبول عام حاصل ہوا:

''بلاشبہ شریعت کی بنا اور اساس دنیا وآخرت میں بندوں کی مصلحت پر ہے۔ شریعت پوری کی پوری سراپا عدل ہے، رحمت ہے، حکمت ہے، مصلحت ہے، جو حکم بھی عدل سے ظلم کی طرف رحمت سے اس کی ضد کی طرف، حکمت سے لغویت کی طرف اور مصلحت سے مفسدہ کی طرف منتقل ہو جائے اس کا شریعت سے ذرہ برابر بھی کوئی تعلق نہیں خواہ اسے تاویل کر کے شریعت میں داخل کر دیا جائے۔ (إعلام الموقعین (۳/۳) لابن القیم)۔

۳- ہمارا ایمان ہے کہ دین میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور کھلا ہی رہے گا، کیونکہ کوئی بھی شخص اس دروازہ کو بند کرنے کا اختیار نہیں رکھتا جسے اللہ اور اس کے رسول نے کھولا ہو بلکہ اجتہاد تو امت پر عائد فرائض کفایہ میں سے ایک ہے۔ ہمارے بعض ائمہ کی تو رائے یہ ہے کہ کسی بھی زمانہ کا کسی ایسے مجتہد سے خالی ہونا جائز نہیں جو عوام کو درپیش نئے احوال وظروف میں ان کے لئے حکم شرعی بیان کرے۔

ہم اپنے موجودہ دور میں حقیقی اجتہاد کے سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں، کیونکہ ہمارا زمانہ ہمارے سابق ائمہ فقہ کے اجتہادی زمانہ سے بہت مختلف ہے۔ جب امام ابوحنیفہ اور ان کے صاحبین کے بیشتر اختلافات کے بارے میں اہل فقہ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ اور دور کا اختلاف ہے نہ کہ حجت وبرہان کا، حالانکہ صاحبین کا زمانہ اپنے امام کے زمانہ سے قریب تھا اور اس دور میں زندگی ٹھہری ہوئی تھی تو آج کے دور کے بارے میں کیا کہا جائے گا جب کہ اجتہاد کے زمانوں پر صدیاں بیت چکی ہیں؟ اسی طرح ہماری زندگی کی ہر چیز اپنی سابقہ نوعیت سے بدل چکی ہے؟ لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اجتہاد کے دروازہ کو بہ ہمہ انواع واقسام: کلی، جزئی، مطلق اور مقید کھول دیں، ہم جدید مسائل میں تخلیقیت

پر اور قدیم فقہی احکام میں انتخاب پر اپنی اپنی توجہ مرکوز کریں۔

لیکن اجتہاد کا دروازہ اس کی اہلیت رکھنے والے ہی پر اور محل اجتہاد ہی میں کھل سکتا ہے۔ جہاں تک اہلیت اجتہاد کا تعلق ہے تو اس کا مصداق وہی شخص قرار پا سکتا ہے جس میں وہ تمام بنیادی شرائط اور صلاحیتیں بیک وقت جمع ہوں جن پر فقہاء اور ماہرین اصول فقہ کا اتفاق ہے جیسے قرآن وسنت کا ایسا ٹھوس علم جو اجتہاد کرنے والے کو ان دونوں مآخذ سے استفادہ کے قابل بنائے، عربی زبان اور علوم عربیہ کا گہرا علم بھی اسی درجہ میں ضروری ہے، اسی طرح اصول فقہ اور مقاصد شریعت کا وسیع علم نیز فقہ کی گہری واقفیت، اسی طرح فقہاء کے اختلاف اور ان کے مختلف مکاتب فکر محققانہ مطالعہ بھی اس کے بنیادی لوازم میں سے ہے۔فقہاء کے مختلف مسالک اور آراء کا جاننا اس لئے ضروری ہے تکہ اس میں ایک ایسی فقہی بصیرت پیدا ہوجائے جس کے ذریعہ وہ عملی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے مستنبط کر سکے۔

اجتہاد کے لئے محل کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یعنی ظنی احکام ہی اس کا محل ہیں۔ظنی احکام سے مراد وہ احکام ہیں جن کی دلیل ثبوت یا دلالت کے اعتبار سے یا دونوں پہلوؤں سے ظنی ہو۔شریعت کی بیش تر تفصیلات اسی قبیل سے ہیں۔

جہاں تک قطعی احکام کا تعلق ہے تو ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں۔ایسے احکام بہت کم ہیں مگر وہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ ان مسلمات کی نمائندگی کرتے ہیں جو امت کی اعتقادی ،فکری، وجدانی اور تہذیبی وحدت کے تحفظ کے ضامن ہیں تا کہ امت تحلیل نہ ہوجائے یا دیگر اقوام ضم نہ ہوجاے۔

ظنی احکام کی اساس یہی قطعی احکام ہیں اور ان ہی قطعیات کی روشنی میں ان ظنیات کی تفہیم کی جائے گی۔

ہم تمام فقہی مسالک کے درمیان تقابلی فقہ کا دروازہ کھولنے کی دعوت دے رہے ہیں تا کہ ایک ہمہ گیر اسلامی فقہ کی تشکیل تک ہماری رسائی ہو سکے۔اسی طرح ہم ایسے علمی مراکز کی تاسیس وتعمیر کی دعوت دے رہے ہیں جن میں امت کو درپیش تمام اہم مسائل پر غور وخوض اور تحقیق واجتہاد کے لئے تمام اسلامی مکاتب فکر کے نمائندے موجود ہوں۔

اسلام، اعتدال اور جامعیت:

ہمارا ایمان اس مثبت اور اعتدال پسند نظام فکر پر ہے جو دین ودنیا کے امور میں ہر طرح کے افراط وتفریط اور نقص وزیادتی سے پاک توازن اور میانہ روی پر مبنی ہے۔اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل ارشاد میں اسی موقف کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے فرمایا:"**ألا تطغوا فی المیزان و أقیموا الوزن بالقسط و لا تخسروا المیزان**" (الرحمٰن:۵۵/۸-۹)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام ہر معاملہ میں اعتدال کی صفت سے متصف ہے اور اسے اپنی امت کی بنیادی خصوصیت قرار دیتا ہے: "**و کذلک جعلناکم أمة وسطا**" (البقرہ:۲/ ۱۴۳)۔

۱- ہمارا ایما جس اعتدال پسندی پر ہے وہ ہر شعبہ میں خواہ اعتقادی ہو یا عملی، مادی ہو یا روحانی، انفرادی ہو یا اجتماعی مثبت توازن کی نمائندگی کرتی ہے۔ چنانچہ یہ اعتدال پسند نظام فکر وعمل ایک فرد کی زندگی میں روح ومادہ، عقل وقلب، حقوق وفرائض اور دنیا وآخرت کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے:"**ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة**" (البقرہ:۲/۲۰۱)۔"**وابتغ فیما آتاک الله الدار الآخرة ولا تنس نصیبک من الدنیا**" (القصص:۲۸/ ۷۷)۔

دوسری طرف اسلام فرد اور معاشرہ کے درمیان منصفانہ پیمانے مقرر کرتا ہے، لہٰذا وہ فرد کو اتنے زیادہ حقوق اور آزادیاں نہیں دے

دیتا کہ ان کے زیر اثر اجتماعی مصالح قربان ہوجائیں جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام نے کیا اور نہ وہ معاشرہ کو اتنے وسیع اور اعلیٰ اختیارات عطا کر دیتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں فرد پر ظلم و زیادتی ہونے لگے اور بالآخر وہ کم زور و ناتواں ہوجائے اس کے جذبات سرد پڑ جائیں اور اس کی صلاحیتیں مضمحل ہوجائیں جیسا کہ سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظام نے کیا۔

اس کے برعکس اسلام فرد اور معاشرہ دونوں کو بغیر کمی اور زیادتی کے ان کے حقوق عطا کرتا ہے۔شریعت کے احکام اور اس کی ہدایت میں فرد و معاشرہ کے ان ہی حققو کو منضبط کیا گیا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ دین میں غلو پسندی فرد اور معاشرہ کے لئے قاتل ہے:

''تم دین میں غلو سے پرہیز کرو، کیونکہ تم سے پہلے کی امتیں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوئیں'' (سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب قدر حصی الرمی، حدیث نمبر ۳۰۲۰، بروایت حضرت ابن عباس، سنن النسائی، کتاب مناسب الحج، باب التقاط الحصی، حدیث نمبر ۳۰۰۷، مسند احمد۔ کتاب مسند بنی ہاشم، باب مسند عبداللہ بن عباس، حدیث نمبر ۱۷۵۴، اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں)۔

اسی طرح دین کی گرفت، اس کی اقدار، اس کے عقائد اور قوانین سے آزادی بھی انسان کے لئے تباہ کن ہے۔اس لئے ہم شعبۂ زندگی میں اعتدال پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، کیونکہ یہی امت کے لئے مناسب ہے اور اسی سے اس کی کمزوریوں کا ازالہ ہوسکے گا۔

لہٰذا یہ نقطۂ نظر تنگ نظر مذہبیت کے دعوے داروں اور بے لگام لامذہبیت کے علم برداردوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ نقطۂ نظر منحرف اور بدعت پر مبنی تصوف کے پیروکاروں اور متحفظ اور پابند شریعت تصوف کے مخالفین کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ نقطۂ نظر نص قطعی کے بالمقابل عقل کو فیصل بنانے والوں اور تفہیم نص کی سطح پر بھی عقل کے کردار کو نظر انداز کرنے والوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ علی الاطلاق الہام کا انکار کرنے والوں کے درمیان جو سرے سے اس کے وجود اور اثرات ہی کے منکر ہیں اور ان لوگوں کے درمیان جو اس کو تسلیم کرنے میں اس حد تک مبالغہ کر گئے ہیں کہ انہوں نے اسے احکام شرعیہ کا ایک ماخذ قرار دے رکھا ہے، ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ فروع و جزئیات تک میں شدت کی دعوت دینے والوں اور اصول و کلیات تک میں نرمی کی نمائندگی کرنے ولوں کے درمیان نقطۂ اعتدال ہے۔

روشن نقوش ہدایت پر مبنی ورثہ کو کالعدم قرار دینے والوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ عملی صورت حال کو خاطر نہ لانے والے مثالیت پسندوں اور اعلیٰ قدروں کو تسلیم کرنے والے حقیقت پسندوں کے نقطۂ نظر کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ ایک نقطۂ اعتدال ہے معاشرہ کے مصالح کو قربان کر کے فرد کو مقدس اور اہم ٹھہرانے والے لبرل ازم'' کے فلسفہ کی دعوت دینے والوں اور فرد کے مصالح کو قربان کر کے معاشرہ کو مقدس اور اہم ٹھہرانے والے مارکسی اجتماعی فلسفہ کی دعوت دینے والوں کے درمیان۔

یہ وسائل و آلات تک میں جمود کے علم برداروں اور مبادی و مقاصد تک میں ارتقاء کے علم برداروں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ دین کے اصول وقطعیات تک میں تجدید واجتہاد کی صدا بلند کرنے والوں اور سابق فقہاء کے وہم وگمان میں بھی نہ آنے والے عصری مسائل تک میں تقلید اور مخالفت اجتہاد کا بیڑا اٹھانے والوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ مقاصد شریعت کو ملحوظ رکھنے کے عنوان کے تحت قطعی نصوص تک کو بے بنیاد قرار دینے والوں اور نصوص کی رعایت کے نام سے کلی مقاصد تک کو نظر انداز کر دینے والوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ بغیر حدود وقیود کے دنیا میں توسع کا جھنڈا اٹھانے والوں اور بغیر کسی جواز کے اپنی ذات میں سمٹے رہنے کی اپیل کرنے والوں کے درمیان ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ کافر قرار دینے میں غلو سے کام لینے کی ہدایت جاری کرنے والوں کے درمیان جنہوں نے دین دار مسلمانوں تک کو کافر قرار دے ڈالا اور ان لوگوں کے درمیان جو کھلم کھلا ارتداد اختیار کرنے والے، دین دشمن اور مسلم دشمن ایجنٹوں تک کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں، ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ حرام قرار دینے میں اس حد تک مبالغہ کرنے والوں کے درمیان کہ گویا زمین پر کوئی چیز حلال ہے ہی نہیں اور حلال قرار دینے میں اس حد تک مبالغہ کرنے والوں کے درمیان کہ گویا دنیا میں کچھ حرام ہے ہی نہیں، ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

یہ حال ومستقبل سے بے خبر ماضی میں غرق رہنے والوں اور اپنے ماضی کو اس حد تک نظر انداز کر دینے والوں کے درمیان کہ گویا وہ زمانہ سے لفظ ''گزشتہ کل'' اور زبان کے اندر سے ''فعل ماضی'' کو مٹا ڈالنا چاہتے ہیں، ایک نقطۂ اعتدال ہے۔

۲- اس متوازن اعتدال پسندی کی تکمیل ایک ہمہ گیر جامعیت سے ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے قانونی پہلو کی ظاہری تطبیق اسلام کی بنیادی ترجیح اور غایت نہیں ہے۔ اس کا اولین میدان کار اور بنیادی مقصد ایک حقیقی نہ کہ صرف صوری، اسلامی زندگی کے قیام کے لئے تیز رفتار جدوجہد کرنا ہے۔ ایک ایسی زندگی جو لوگوں کے اندرون کی اصلاح کے لئے کوشاں اور سرگرم عمل ہو تا کہ اللہ اس کے نتیجہ میں ان کے احوال درست فرمادے، اس زندگی کے زیر سایہ ایک مومن انسان، ایک ہم آہنگ خاندان، ایک مربوط معاشرہ، اور قوت اور ایمان داری کی دولت سے مالا مال ایک منصفانہ حکومت وجود میں آسکے۔ ایک ایسی ہمہ گیر اسلامی زندگی جس کا رہنما اسلامی عقیدہ ہو، جس پر حکومت اسلامی شریعت کی ہو، جس پر بالا دستی اسلام تصورات کو حاصل ہو، جسے اسلامی اخلاق منضبط کریں اور جسے رونق وتازگی اسلامی آداب واقدار بخشیں۔

باہمی تعاون پر مبنی ایک منظّم معاشرہ کی زندگی جس کی بنیاد ایک دوسرے کو تقویت پہنچائے، یہاں ایسا نہ ہو کہ ایک شخص بھوکا ہو اور اسی کے پہلو میں اس کا پڑوسی شکم سیر ہو کر کھائے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں ان پڑھ و ناخواندہ کو نفع بخش علم دستیاب ہو، ہر بے روزگار کو مناسب روزگار حاصل ہو، ہر مزدور کو منصفانہ مزدوری ملے، ہر بھوکے کو ضرورت کے مطابق کھانا ملے، ہر بیمار کے لئے کامیاب علاج کا انتظام ہو، ہر شہری کو صحت بخش رہائش فراہم ہو، ہر ضرورت مند کی ضرورت کا پورا سامان مہیا کرایا جائے، ہر بے بس انسان بطور خاص بچوں، بوڑھوں، بیواؤں اور معذوروں کی تمام مادی اور سماجی ضروریات کی پوری طرح تکمیل کی جائے۔ اس زندگی میں ہر طرح کی قوت اور توانائی موجود ہو۔ فکر کی قوت، روح کی قوت، جسم کی قوت، اخلاق کی قوت، معاش کی قوت، اسلحہ اور دشمن سے مقابلہ کی تیاری کی قوت، اسی کے ساتھ ساتھ اتحاد اور ہم آہنگی کی قوت اور ان سب قوتوں کی اساس ہو ایمان کی قوت۔

اسلام اور انسان:

۱-اسلام کی نظر میں انسان بہ ذات خود ایک معزز مخلوق ہے:"ولقد کرمنا بنی آدم" (الإسراء:۱۷/۷۰)،(اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی)۔

اسے زمین کو آباد کرنے کے لئے اس کا خلیفہ مقرر کیا ہے:"و إذ قال ربک للملائکة إنی جاعل فی الأرض خلیفة" (البقرہ:۲/۳۰)،(جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں)۔

انسان چونکہ معزز اور روئے زمین کا خلیفہ ہے اس لئے اسے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کا سربراہ بنایا ہے اور تمام مخلوقات کو اس کی خدمت کے لئے مسخر کر دیا ہے:"ألم تروا أن الله سخرلکم ما فی السماوات و ما فی الأرض" (لقمان:۳۱/۲۰)۔(کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے تمہارے لئے کام میں لگا دیا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)۔

"وسخرلکم ما فی السماوات وما فی الأرض جمیعاً منه"(الجاثیۃ ۴۵/۱۳)۔(اور اس نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کر دیا، سب کو اپنی طرف سے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متعدد ایسے حقوق عطا فرمائے ہیں جو اس کے شرف کے تحفظ اور اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اس کے معاون ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان حقوق کے تحفظ کا حکم دیا ہے اور انہیں بنیادی فرائض قرار دیا ہے۔ ان حقوق میں سرفہرست انسان کی یہ آزادی ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے، اختیار کر سکتا ہے۔ اسلام عقیدہ کی آزادی کا اس درجہ خواہاں ہے کہ اس نے مسلمانوں کو عقیدہ کے دفاع میں قتال کا حکم دیا ہے:"وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة" (الأنفال:۸/۳۹)۔(اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے)۔

۲-اسلام میں انسان کا ایک حق عقل پر خاص توجہ دینا اور انسان کی تفکیر و تحقیق کی صلاحیتوں کو آزاد رکھنا ہے۔ اسلام آفاق و انفس میں غور و فکر پر مبنی ایک علمی ذہنیت کی تشکیل کی کوشش کرتا ہے:

"أولم ینظرا فی ملکوت السماوات والأرض و ما خلق الله من شیئ" (الأعراف:۷/۱۸۵)۔(کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے نظام پر نظر نہیں کی اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان پر)۔

"ویتفکرون فی خلق السماوات والأرض" (آل عمران ۳/۱۹۱)،(جو آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں)۔

لہٰذا جو شخص یہ کہے کہ فکری صلاحیت کا استعمال ایک اسلامی فریضہ ہے وہ راہِ راست سے منحرف نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کا بیان ہے:

"قل إنما أعظکم بواحدة أن تقوموا لله مثنی و فرادی ثم تتفکروا" (سبأ:۳۴/۴۶)۔

(کہو میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، یہ کہ تم خدا کے واسطے کھڑے ہو جاؤ، دو دو اور ایک ایک، پھر سوچو)۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دس سے زائد بار فرمایا ہے:"أفلا تتفکرون" (الانعام:۶/۵۰)،(کیا تم غور نہیں کرتے)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں غور و فکر کا حکم دیا ہے اور اس پر ابھارا ہے، مثال کے طور پر اس نے فرمایا:"قل انظروا ماذا فی السماوات والأرض" (یونس:۱۰/۱۰۱)،(کہو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے دیکھو)۔

"أفلا ینظرون" (الغاشیۃ:۸۸/۱۷)،(تو کیا وہ نہیں دیکھتے) "أفلم ینظروا" (ق:۵۰:۶)،(کیا ان لوگوں نے نہیں

دیکھا)۔

اسلام اندھی تقلید اور آباءواجداد کی جامد راہ یا سماجی اقتدار کے حامل رؤسا کے حکم پر چلنے کا مخالف ہے:''**وإذ قيل لهم اتبعوا ما أنزل الله قالوا بل نتبع ما ألفينا عليه آبائنا أولو كان آباؤهم لايعقلون شيئاً ولا يهتدون**'' (البقرۃ:۲/۱۷۰)۔(اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر چلو جو اللہ نے اتارا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔کیا اس صورت میں بھی کہ ان کے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ سیدھی راہ جانتے ہوں)۔

''**وقالوا ربنا إنا أطعنا سادتنا و كبراء نا فأضلونا السبيلا**'' (الاحزاب:۳۳/۶۷)،(اور وہ کہیں گے:اے ہمارے رب!ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا تھا تو انہوں نے ہم کو راستے سے بھٹکا دیا)۔

اسی طرح اسلام یقین کے مقتضی موقع پر گمان یا خواہش یا حق سے بھٹکانے والے جذبات کی پیروی کو مسترد کرتا ہے:''**ومالهم به من علم إن يتبعون إلا الظن و إن الظن لايغني من الحق شيئاً**'' (النجم:۵۳/۲۸)۔(حالانکہ ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں،وہ محض گمان پر چل رہے ہیں اور گمان امر حق میں ذرا بھی مفید نہیں)۔

''**ولاتتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله**'' (ص:۳۸/۲۶)،(اور خواہش کی پیروی نہ کرو،وہ تم کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی)۔

اللہ تعالیٰ نے اہل شرک کی مذمت ان الفاظ میں کی ہے:''**إن يتبعون إلا الظن وما تهوى الأنفس ولقد جائهم من ربهم الهدى**'' (النجم:۵۳/۲۳)،(وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور نفس کی خواہش کی،حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے)۔

اسلام کسی دعوے کو بغیر اس کو درست ثابت کرنے والے ثبوت کے تسلیم نہیں کرتا:''**قل هاتوا برهانكم إن كنتم صادقين**'' (البقرہ:۲/۱۱۱،النمل:۲۷/۶۴)،(کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم سچے ہو)۔

اسلام جس طرح عقلی امور میں برہان کو تسلیم کرتا ہے،اسی طرح وہ محسوسات مشاہدہ کو تسلیم کرتا ہے:''**أشهدوا خلقهم**'' (الزخرف:۴۳/۱۹)،(کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے)۔

اسلام نقلی امور میں تصدیق کو قبول کرتا ہے:''**ائتوني بكتاب من قبل هذا أو أثارة من علم إن كنتم صادقين**'' (الأحقاف:۴۶/۴)(میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے کر آؤ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو،اگر تم سچے ہو)۔

اسلام دینی امور میں وحی کے ثبوت کو قبول کرتا ہے جیسا کہ قرآن نے اللہ کی حلال ٹھہرائی ہوئی پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دینے والوں کو چیلنج کرتے ہوئے کہا:''**أنبؤني بعلم إن كنتم صادقين**'' (الانعام:۶/۱۴۳)۔(مجھے دلیل کے ساتھ بتاؤ اگر تم سچے ہو)۔

اسی طرح قرآن نے ان لوگوں کو بھی چیلنج کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ان کا شرک اللہ کی مشیت یعنی اس کی رضا سے ہے:

''**قل هل عندكم من علم فتخرجون لنا إن تتبعون إلا الظن و إن أنتم إلا تخرصون**'' (الانعام:۶/۱۴۸)،(کہو کیا تمہارے پ۔سکوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے پیش کرو،تم تو صرف گمان کی پیروی کر رہے ہو اور محض اٹکل سے کام لیتے ہو)۔

۳-اسلام علم،اس میں امتیازی مقام حاصل کرنے،اس کے جدید ترین اسالیب اختیار کرنے اور ہر میدان میں اس کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔اسلام غور وفکر کرنے کو عبادت اور امت کی ضروریات کے دائرہ میں آنے والے ہر علم کی تلاش کو ایک فریضہ قرار دیتا

ہے۔ ’’علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے‘‘ (سنن ابن ماجہ، المقدمہ، یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے جن کی تعداد بقول سیوطی پچاس تک جا پہنچی ہے، حسن ہے)۔علم کے قافلہ سے بچھڑ جانا ایک منکر اور جرم ہے۔ اسلام کا تصور یہ ہے کہ علم کے نظریاتی، تطبیقی، سول اور جنگی تمام شعبوں میں برتری حاصل کرنا ایک دینی فریضہ ہے۔ اسلام کے نزدیک صریح عقل اور صحیح نقل کے درمیان کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ ہمارے علماء کے اصول کے تحت عقل ہی نقل کی اساس ہے، اس لئے کہ عقل ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا وجود، عمومی نبوتوں کا وجود اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی نبوت کا وجود ثابت ہے۔ ہماری ثقافت میں علم کے حقائق اور اسلام کی قطعیات کے درمیان کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا یہاں کشمکش کا کوئی امکان ہی نہیں۔ ہماری تاریخ میں علم اور دین کے درمیان کوئی نزاع برپا نہیں ہوئی جیسا کہ دیگر مذاہب میں ہوئی، کیونکہ دین ہمارے ہاں علم ہے اور علم ہمارے ہاں دین ہے۔

اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی ورثہ پر فخر کیا جائے، اس سے رہنمائی حاصل کی جائے، ہدایت کے حصول میں ثابت شدہ معصوم الٰہی سطح میں جو محدود ہے اور تجدد پذیر انسانی سطح میں جو وسیع ہے، امتیاز کیا جائے، چنانچہ اول الذکر سے ہدایت اور نور کو حاصل کیا جائے اور مؤخر الذکر سے رہنمائی کی جائے اور اس میں انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جائے، کیونکہ یہ مؤخر الذکر سطح بھی ایک معیار ہدایت ہے نہ کہ جکڑ نے والی کوئی بیڑی۔ اسلام تو پورے عالم کے علمی وفکری ورثہ کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے، وہ حکمت کو خواہ اس کا سرچشمہ کچھ بھی ہو، تلاش کرتا ہے اور قوموں کے قدیم وجدید تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے بشرطیکہ وہ اس کے عقیدے، اس کی شریعت اور اس کی اقدار کے منافی نہ ہو۔ وہ کسی قدیم رائے کی عصبیت اور کسی جدید فکر کی غلامی سے آزاد ہو کر دوسروں کی بہترین چیزوں کو اختیار کر لیتا ہے۔ وہ نہ ماضی سے کٹتا ہے، نہ حال سے دوری اختیار کرتا ہے اور نہ مستقبل سے بے خبر رہتا ہے۔

اسلام قوموں کے حقوق اور ان کی آزادیوں کے تحفظ سے متعلق انسانی تجربہ اور ان علوم کا کھلے دل سے استقبال کرتا ہے جو نظریات، وسائل اور تحفظات کے ضمن میں اپنی افادیت ثابت کر چکے ہیں۔ اسی طرح اسلام بغیر کسی قید کے ان کو قبول کرنے کے لئے سرگرم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ حکمت مومن کی گم شدہ دولت ہے، وہ اسے جہاں پالے وہی اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے انسانی فلسفیوں، نظاموں اور تجربات کا قبول کیا جانا اس شرط سے مشروط ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ صحیح اور ازروئے دلالت صریح نص سے متصادم نہ ہوں، نہ کسی ثابت شدہ شرعی قاعدہ کے معارض ہوں۔ ایک اسلامی معاشرہ دوسری تہذیبوں سے اخذ کردہ فلسفیوں، نظاموں اور تجربات پر اپنی روح، اپنی اقدار اور اپنے قوانین کا ایسا رنگ چڑھا دیتا ہے کہ وہ اسلامی نظام کا ایک جز بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک مسلم سماج دوسروں سے حاصل کردہ علوم ونظریات میں ایسے ترامیم واضافے کر دیتا ہے کہ ان کے نتیجہ میں ان علوم و نظریات کی سابقہ قومیت ختم ہو جاتی ہے اور انہیں اسلامی قومیت حاصل ہو جاتی ہے۔

۴- اسلام کی نظر میں انسان کا ایک حق جسمانی، نفسیاتی اور عقلی صحت کا تحفظ بھی ہے: ’’بیشک تمہارے جسم کا تم پر ایک حق ہے‘‘ (صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف، حدیث نمبر: ۵۷۸۳، صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النہی عن صوم الدہر، حدیث نمبر: ۱۱۵۹، بہ روایت حضرت ابوسلمہ)۔ جسم کا انسان پر یہ حق ہے کہ اسے بھوک لگنے پر کھانا کھلایا جائے، تھکنے پر اسے آرام پہنچائے، گندا ہونے پر اسے صاف کرے، کمزور ہونے پر اسے طاقتور بنائے اور بیمار ہونے پر اس کا علاج کرائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر بیماری کے ساتھ اس کا علاج بھی نازل فرمایا ہے، جس نے اس کا علم حاصل کیا اس نے اس کو جس نے اس کا علم نہیں حاصل کیا وہ اس سے ناواقف رہا۔

اسلام نے متعدی امراض کے سلسلے میں اللہ کی سنت کو تسلیم کیا ہے۔ اسلام نے سیرم (Serum) اور ٹیکہ (Vaccine) جیسے تدبیری وسائل اختیار کرنے کو لازم قرار دیا ہے، اسلام نے عمومی امراض اور بہ طور خاص متعدی امراض سے تحفظ کا ضابطہ مقرر کیا ہے۔ اسلام

نے وباء کی صورت میں اجتماعی حفظان صحت کو ملحوظ رکھتے ہوئے صحت سے متعلق متعدد پابندیاں عائد کی ہیں۔ اسلام نے صحت کے ہمہ جہت تحفظ کو خاص طور پر ماؤں اور بچوں کے حوالے سے، لازمی قرار دیا ہے۔ اسلام نے ہر مزدور کو آرام کا اور ہر بیمار کو علاج کا حق عطا کیا ہے، اسی طرح اسلام نے عمر دراز افراد نیز معذور حضرات اور ان جیسے دوسرے خصوصی ضرورت مندوں کے حقوق کا بورا پورا لحاظ کیا ہے۔ اسلام نے متعدد شرعی احکام اور متنوع دینی اور اخلاقی ہدایات کے ذریعہ جن کا ایک مسلمان ڈاکٹر اور علاج ومعالجہ اور مریض کی دیکھ بھال میں اس کا معاون پابند ہے، صحت اور طب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

اسی طرح اسلام جسمانی تعلیم کا بھی خیر مقدم کرتا ہے اور اسے مقصد نہیں بلکہ وسیلہ قرار دیتا ہے۔ یہ تعلیم انسانی جسم کو لچک، کھردرے پن اور قوت سے آراستہ کرتی ہے، کیونکہ طاقتور مومن اللہ کی نظر میں کمزور مومن سے بہتر اور پسندیدہ ہے۔

اسلام ہر انسان اور بہ طور خاص مسکین کو اس کی ضرورت کے لئے کافی اور مناسب غذا فراہم کئے جانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسکین کو کھلانے پر ابھارنا اسلام میں فرض ہے اور اس فریضہ کو نظر انداز کرنا دین کو جھٹلانے کی ایک علامت ہے: "**أرأيت الذى يكذب بالدين فذلك الذى يدع اليتيم ولا يحض على طعام المسكين**" (الماعون: ۱۰۷/۱-۳)۔ (کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو انصاف کے دن کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں ابھارتا)۔

اسلام قانون اور تعلیم کے ذریعہ زنا، جنسی بے راہ روی اور ان کے ذرائع واسباب کا مقاطعہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ منشیات، جسمانی اعضاء کو سن کر دینے والی اشیاء، سگریٹ نوشی نیز جسم، روح اور عقل کے لئے مضر ہر قسم کے زہر کا شدید مخالف ہے۔ کیونکہ اسلام میں نہ نقصان اٹھانا جائز ہے اور نہ نقصان پہنچانا، ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ خود کو ضرر میں مبتلا کرے خواہ وہ ضرر فوراً پیش آنے والا ہو یا بہ تدریج: "**ولا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيما**" (النساء: ۴/۲۹)۔ (اور خون نہ کرو آپس میں، بے شک اللہ تمہارے اوپر بڑا مہربان ہے)۔

ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ قصداً طویل بھوک کے ذریعہ یا حد اعتدال سے زیادہ کھانا کھا کر اپنے جسم کو نقصان میں مبتلا کرے، کیونکہ شریعت میں جائز اشیاء کے استعمال پر فضول خرچی سے پرہیز کی قید لگادی گئی ہے: "وكلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا يحب المسرفين" (الاعراف: ۷/۳۱)، (اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

۵- اسلام اپنی دینی سفارشات، اپنی اخلاقی تعلیمات اور اپنی قانونی ہدایات کے ذریعہ ماحولیات کے تمام تشکیلی عناصر ولوازم سمیت اس کے تحفظ کی عملی تدابیر اختیار کرتا ہے اور تخریب، تضییع یا لاپروائی جیسی کسی بھی صورت سے اس کے بگاڑے جانے کی ممانعت کرتا ہے۔ یہ اسلام کی نظر میں "فساد في الأرض" کی مختلف شکلیں ہیں جنہیں تمام آسمانی مذاہب نے ممنوع قرار دیا ہے اور قرآن نے اس کی سنگینی پر زور دیتے ہوئے فرمایا: "ولا تفسدوا في الأرض بعد إصلاحها" (الاعراف: ۷/۵۶)، (اور زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد)۔

"والله لا يحب الفساد" (البقرہ: ۲/۲۰۵)، (حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا)۔

اسلام میں تحفظ ماحولیات کی درج ذیل بنیادیں ہیں:

الف: شجر کاری اور شادابی، اس سلسلہ میں یہ حدیث ایک شاہکار ہے:

"اگر قیامت برپا ہونے ہی والی ہو اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو اور وہ قیامت آنے سے پہلے اسے لگا سکتا ہو تو ضرور لگا دے" (مسند احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، باب باقی مسند السابق حدیث نمبر: ۱۲۵۱۲، بہ روایت انس، امام احمد اس حدیث کی روایت میں منفرد ہیں اور اس حدیث کے راوی

ثقہ ہیں)۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: ''جومسلمان کوئی پودالگائے یا کی چیز کی کاشت کرے اوراس میں سے کوئی برندہ یاانسان یا کوئی چوپایہ کھائےتو وہ لگانے والے یا کاشت کرنے والے کے لئے صدقہ ہوجاتا ہے'' (صحیح بخاری، کتاب المزارعة، باب فضل الزرع والغرس، حدیث نمبر ۲۱۵۲، بہ روایت انس بن مالک، صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع، حدیث نمبر: ۲۹۰۴، بہ روایت انس بن مالک)۔

ب: آبادکاری اورافزائش اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''هو أنشأكم من الأرض واستعمركم فيها'' (ہود: ۱۱/ ۶۱)۔ (اسی نےتم کو زمین بنایااوراس میں تم کوآبادکیا)۔

یہاں ''استعمرکم'' سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم سے مطالبہ یہ ہے کہ تم اس ارض کوآبادکرو، لہٰذا آبادکاری بھی اسی طرح تخلیق کا ایک مقصد ہےجس طرح عبادت۔

ج: پاکی اورصفائی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''إن الله يحب التوابين و يحب المتطهيرن'' (البقرہ: ۲/ ۲۲۲)، (اللہ دوست رکھتا ہےتوبہ کرنے والوں کواوروہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو)۔

اسی لئےحسی اورحکمی دونوں طرح کی طہارت کونماز کی صحت کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے جسم، گھر، راستہ اورمسجد وغیرہ کی صفائی کا حکم دیا ہے۔

د: وسائل کا تحفظ۔ اس لئے کہ یہ انسان کے لئے اللہ کی ایک نعمت ہیں۔ لہٰذا اس عظیم نعمت کا تقاضہ ہے کہ ان وسائل کی حفاظت کی جائے، ان کی دستیابی پر اللہ کا شکرادا کیا جائے، ان کی قدر کرکے ان کا تحفظ کیا جائے اورمزید کا استحقاق پیدا کیا جاۓ: ''لئن شكرتم لأزيدنكم'' (ابراہیم: ۱۴/ ۷)، (اگرتم شکر کروگےتو میں تم کو زیادہ دوں گا)۔

یہاں مذکوروسائل میں حیوانی، نباتاتی، زرعی، آبی، سمندری اورمعدنی ذرائع شامل ہیں۔ لہٰذا ان ذرائع اوروسائل کو بربادکرنا، یاان کے بارے میں لاپروائی برتنا یاان سے کھلواڑ کرنا یاان کے سلسلے میں کسی بھی طرح کے ظلم وزیادتی کا ارتکاب کرنا ناجائز ہے، کیونکہ یہ پوری امت کے سرمایےاوراس کے اپنے وسائل زیست میں اس کے حق پردست درازی ہے۔

ایسی احادیث موجود ہیں جو گورۓ کوناحق مارڈالنے، صحرا میں بیر کے بغیر چھوڑ دینے، زمین پرگرے لقمہ کو نہ اٹھانے، اسے صاف کرکے نہ کھانے اوراسے شیطان کے لئے چھوڑ دینے کے برے انجام سے خبردار کرتی ہیں۔

۵- ماحول کے ساتھ حسن سلوک۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے حوالہ سے حسن لوک کوفرض قرار دیا ہےاورعدل واحسان کا حکم دیا ہے۔ ماحول کے ساتھ حسن سلوک میں انسان، حیوان، نباتات، زمین، مٹی، ہر ذی حیات کی بنیاد پانی، ہواجس میں انسان سانس لیتا ہےاور ہر جان دارمخلوق کے حسن سلوک کا رویہ شامل ہے۔ لہٰذا جوشخص ان اشیاء کے استعمال میں حسن سلوک کا رویہ اختیار کرے گا وہ ان نیکوکارافراد کے زمرہ میں شامل ہوگا جنھیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے: ''وأحسنوا إن الله يحب المحسنين'' (البقرہ: ۲/ ۱۹۵)، (اورکام اچھی طرح کرو۔ بےشک اللہ پسند کرتا ہےاچھی طرح کام کرنے والوں کو)۔

و: ماحولیات کوتضییع سے بچانا۔ اس میں ہرقسم کی تضییع شامل ہےخواہ وہ بےرحمی یاغصہ کے زیراثر ہو یاکھیل کھیل میں یالاپروائی کے نتیجہ میں۔ ''جوایک بیرکا ردخت کاٹے گا اللہ تعالیٰ اس کے سرکوجہنم میں پست کرکے ڈالے گا'' (سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب من قطع السدر، حدیث نمبر: ۵۲۳۹، بہ روایت عبداللہ بن حبشی، سنن البیہقی، باب ماجاء فی قطع لاسدر، حدیث نمبر: ۱۱۵۳۸، اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں)۔

ز: ماحولیاتی توازن کا تحفظ۔اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کی تخلیق ایک منصوبہ کے تحت کی ہے۔اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے لئے ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے،لہٰذا کائنات میں کوئی چیز ضابطہ اور توازن کے بغیر نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" **وإن من شيء إلا عندنا خزائنه وما ننزله إلا بقدر معلوم**" (الحجر:۱۵/۲۱)،(اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور ہم اس کو ایک متعین انداز کے ساتھ ہی اتارتے ہیں)۔

ایک توازن وہ ہے جو کائناتی سطح کا ہے اور اہل بصیرت اسے جانتے ہیں۔اس میں بے سبب کسی طرح کا اختلال ناممکن ہے۔البتہ انسانوں کے افعال،ان کی سرکشی اور ان کی ہلاکتوں کے نتیجہ میں یہ توازن ضرور بگڑتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" **والسماء رفعها و وضع الميزان ألا تطغو في الميزان و أقيموا الوزن بالقسط ولا تخسروا الميزان**" (الرحمٰن:۵۵/۷-۹)،(اور اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس نے ترازو رکھ دی کہ تم تولنے میں زیادتی نہ کرو اور انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور تول میں نہ گھٹاؤ)۔

کائنات کو لاحق ایک خطرہ اس کے وسائل و ذرائع کا ناجائز اور غلط مقاصد کے لئے استعمال اور اس کے استعمال میں اعتدال کی حد سے گزرنا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ اگر انسان تسلسل کے ساتھ ماحولیاتی ذرائع و وسائل کا اسی طرح غلط استعمال کرتا رہا تو کائناتی اور ماحولیاتی توازن کے بگاڑ کا وہ خطرہ سامنے آ کھڑا ہوگا جو پوری دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دے گا۔

اسلام اور عورت:

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام نے عورت کو بہ حیثیت انسان کے اعزاز بخشا ہے۔ وہ بھی مرد ہی کی طرح احکام شریعت کی پوری طرح پابند ہے۔ اسے بھی حقوق حاصل ہیں اور اس پر فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **"فاستجاب لهم ربهم أني لا أضيع عمل عامل منكم من ذكر أو أنثى بعضكم من بعض"** (آل عمران: ۳/ ۱۹۵)، (ان کے رب نے ان کی دعاء قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو)۔

اس آیت کے آخری جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ مرد و عورت ایک دوسرے کا حصہ ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اسلام انسانی شرف اور عمومی فرائض کے حوالے سے مرد و عورت کے درمیان برابری کا اصول مقرر کرتا ہے، کیونکہ حدیث ہے: "عورتیں مردوں کی ہم رتبہ نہیں" (اس حدیث کی روایت امام احمد نے مسند (حدیث نمبر: ۲۶۱۹۵) میں حضرت عائشہ سے کی ہے۔ محققین حدیث کہتے ہیں کہ یہ حدیث "حسن لغیرہ" ہے۔ یہ سند ضعیف ہے، کیونکہ اس کے راوی عبداللہ یعنی ابن عمر العمری ضعیف ہیں۔ اس حدیث کی روایت ابوداؤد نے کتاب الطہارۃ (حدیث نمبر: ۲۳۶) میں، ترمذی نے کتاب الطہارۃ (حدیث نمبر: ۱۱۳) میں، ابویعلی نے مسند (۸/ ۱۴۹) میں اور بیہقی نے السن الکبری، کتاب الطہارۃ (۱/ ۱۶۸) میں کی ہے، البانی نے صحیح الجامع الصغیر میں اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے)۔

جہاں تک خاندان اور معاشرہ کے اندر ان دونوں میں سے ہر ایک کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں اسلام دوطرفہ حقوق اور فرائض کے درمیان توازن کا اصول طے کرتا ہے جو عدل کی حقیقت ہے: **"ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف"** (البقرہ: ۲/ ۲۲۸)، (اور عورتوں کے لئے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں)۔

اسلام عورت کا ہر صورت میں محافظ ہے خواہ وہ بیٹی ہو، بیوی ہو، ماں ہو یا خاندان اور معاشرہ کی ایک فرد، اسلام عورت کی بہ حیثیت خاتون، بیوی اور ماں، امتیازی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے عبادت، تعلیم اور روزگار کے عمل میں اس کی شرکت کے لئے وسیع میدان فراہم کرتا ہے، بطور خاص اس وقت جب اسے یا اس کے خاندان کو یا معاشرہ کو اس کی ضرورت ہو، اسی طرح ضرورت پیش آنے پر اسلام اس کے لئے تحفظ و تعاون کے خصوصی انتظامات کرتا ہے یہاں تک کہ اس وقت بھی جب اسے شوہر کی طرف سے زیادتی یا باپ کی طرف سے کوتاہی یا بیٹے کی طرف سے نافرمانی اور بدسلوکی کا سامنا ہو، بشرطیکہ اس کی سرگرمیاں گھر، شوہر اور بیٹے کے حقوق کی ادائیگی کے حوالے اس پر عائد فرائض کو متاثر نہ کریں۔

اس حقیقت سے اختلاف ممکن نہیں کہ خاندان کی نگرانی ہی عورت کی اولین اور بنیادی ذمہ داری ہے، اور اس فریضہ کو اس کے سوا کوئی دوسرا کما حقہ انجام دے بھی نہیں سکتا۔ جہاں تک فاضل وقت اور اضافی سرگرمیوں کا تعلق ہے جن کے اگر مواقع ملیں تو عورت ان کا استعمال اپنی بقیہ سماجی ذمہ داریاں انجام دینے کے لئے کرسکتی ہے۔ ان ذمہ داریوں کے دائرے کا تعین بھی خود عورت کی صورت حال نیز معاشرہ کے احوال وظروف، اس کی ضروریات اور اس کے تغیرات کے تنوع کو پیش نظر رکھ کر ہی کیا جائے گا۔ اس دائرۂ کار میں امامت کبریٰ کو چھوڑ کر سماج کی بقیہ تمام اقتصادی اور سیاسی سرگرمیاں بشمول انتخابات میں بہ حیثیت رائے دہندہ اور امیدوار شرکت، سب شامل ہیں۔ اسلام تو خیر کی دعوت، معروف کی تلقین، منکر کی ممانعت اور شر وفساد کی روک تھام کے حوالے سے مرد پر عائد ذمہ داریوں میں عورت کو بھی شریک کار ٹھہراتا ہے: **"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر"** (التوبۃ: ۹/ ۷۱) (اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں)۔

عورت کے نسوانی وقار اور اس کے انسانی پہلو کے احترام کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلام شدت سے اس بات کی مخالفت کرتا ہے کہ اسے جنسی ترغیبات، کھیل تفریح اور حقیر تلذذ کے لئے بہ طور ذریعہ استعمال کیا جائے۔ اجنبی مردوں سے عورت کا سامنا ہونے کی صورت میں اسلام اس پر لباس، زینت، چال ڈھال، گفتگو اور نظر میں شرم وحیاء احتیاط اور ادب ووقار کی پابندی کو لازم قرار دیتا ہے تاکہ عورت کی شناخت اس کی سنجیدگی سے کی جائے اور کوئی اسے ایذا پہنچانے کی جرأت نہ کرسکے: "ذلک أدنى أن يعرفن فلا يؤذين" (الأحزاب: ۳۳/۵۹)، (اس سے جلدی پہچان ہوجائے گی تو وہ ستائی نہ جائیں گی)۔

نیز بیمار دل مرد اپنی خواہشات سے باز رہیں: "فلا تخضعن بالقول فيطمع الذى فى قلبه مرض و قلن قولاً معروفاً" (الأحزاب: ۳۳/۳۲)، (تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری وہ لالچ میں پڑ جائے اور معروف کے مطابق بات کہو)۔

اسی طرح مرد وعورت دونوں سے اسلام کا مطالبہ ہے کہ باہمی ملاقات کے موقع پر ان آداب کو ملحوظ رکھیں: "قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ...... وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن" (النور: ۲۴/۳۰-۳۱)، (مومن مردوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں......اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں)۔

اسلام مرد وعورت کو حرج میں نہیں ڈالنا چاہتا، نہ سماجی سرگرمیوں میں عورت کی شرکت پر گناہ کو لازم ٹھہراتا ہے بلکہ اس نے جس طرح اسے سماجی سرگرمیوں کے مواقع عطا کئے ہیں، اسی طرح اسے شرعی آداب بھی سکھائے ہیں اور اس کے تیز معاشرہ کے تحفظ کے لئے کچھ قوانین و ضوابط وضع کئے ہیں جیسے عورت کا پردہ، خلوت کا حرام ہونا، اختلاط کے شرائط کا تعین اور سماجی سرگرمیوں میں عورت کی شرکت سے متعلق ان جیسے احکام۔ ان میں بعض قوانین تحفظ اور احتیاط کے تقاضے سے وضع کئے گئے ہیں اور بعض مفاسد ومحرمات کے ذرائع کا سدباب کرنے کے نقطۂ نظر سے تشکیل دیئے گئے ہیں، البتہ یہ تمام کے تمام قوانین سماجی سرگرمیوں میں عورت کی شرکت کو منظّم رخ دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں، اسے ان سرگرمیوں سے روکنے کے لئے ہرگز نہیں۔ اسی لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ ہماری عربی اور اسلامی تاریخ اخواتین کے درخشندہ کارناموں سے پُر ہے جن کا سماج کے تمام ہی شعبوں میں خواہ علم کا میدان ہو یا سیاست کا یا ادب کا یہاں تک کہ جہاد کا بھی، ایک رہنما کردار رہا ہے۔

اسلام اور خاندان:

اسلام خاندان کو معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس کی نظر میں تمام اہل مذاہب کے درمیان معروف فطری اور شرعی ازدواج ہی خاندان کی اساس اور اس کی تشکیل کا واحد طریقہ ہے۔ اسلام دور حاضر کے بعض رجحانات کی ایجاد کردہ شماری کی غیر معروف شکلوں جیسے یک جنسی خاندان (ہم جنسی کی شادی) یا یک تخلیقی خاندان وغیرہ کو مسترد کرتا ہے۔

اسی لئے اسلام شادی پر زور دیتا ہے، اسکے اسباب وغیرہ کو آسان بناتا ہے اور بہ یک وقت تعلیم اور قانون سازی کے ذریعہ اس کے راستہ کی سماجی اور اقتصادی رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ اسلام شادی کو مشکل بنانے والی اور اسے مؤخر کرنے والی بے بنیاد روایات کی مذمت کرتا ہے جیسے مہر کی گرانی، تحائف، دعوتوں اور شادی کی تقریبات میں غلو سے کام لینا، فرنیچر، لباس اور زینت میں اسراف اور ایک دوسرے سے مسابقت جسے اللہ اور رسول تمام ہی قسم کے اخراجات میں ناپسند کرتے ہیں۔ اسلام زوجین میں سے ہر ایک کے انتخاب میں دین اور اخلاق کو ترجیح دیتا ہے: "تم دیندار خاتون سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کرو۔ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں" (صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الاکفاء ف

الدین، حدیث نمبر (۳۰۰۷) بہ روایت حضرت ابو ہریرہ، صحیح مسلم، کتاب الرضاع باب استحباب نکاح ذات الدین، حدیث نمبر: (۲۶۶۱) ب ہروایت حضرت ابو ہریرہ)۔

جب تمہارے پاس ایسے لوگ رشتہ لے کر آئیں جن کے دین واخلاق سے تم مطمئن ہو تو ایسا نکاح کرادو۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا (سنن ابن ماجہ کتاب النکاح، باب الاکفاء، حدیث نمبر: (۱۹۵۷) بہ روایت حضرت ابو ہریرہ، سنن الترمذی، کتاب النکاح باب إذا جائکم من ترضون دینہ حدیث نمبر: (۱۰۰۴) بہ روایت حضرت ابو ہریرہ نیز حدیث نمبر: (۱۰۰۵) بہ روایت ابو حاتم المزنی، امام ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے)۔

اسلام جہاں ایک طرف حلال کے اسباب کو آسان بناتا ہے وہیں دوسری طرف حرام کے دروازے بند کرتا اور اس کے محرکات پر بھی پابندی عائد کرتا ہے جیسے بات یا تصویر، کہانی یا ڈرامہ وغیرہ کے ذریعہ جنسی بے قیدی اور بے حیائی کا فروغ جو بطور خاص ہر گھر میں داخل اور ہر کان وآنکھ تک رسائی حاصل کر چکے میڈیا کے راستہ سے جاری ہے۔

اسلام زوجین کے مابین خاندانی تعلقات کو باہمی تسکین، محبت، ہمدردی دوطرفہ حقوق وفرائض اور معروف کے مطابق مل جل کر ساتھ رہنے کے اصول پر استوار کرتا ہے: "وعاشروهن بالمعروف فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئاً و يجعل الله فيه خيراً كثيرا" (النساء: ۱۹/۴)، (اوران کے ساتھ اچھی طرح گزربسر کرو، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو ناپسند ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو)۔

"ولهن مثل الذى عليهن بالمعروف وللرجال عليهن درجة والله عزيز حكيم" (البقرہ: ۲۲۸/۲)، (ان عورتوں کے لئے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں، اور مردوں کا ان کے مقابلہ میں ایک درجہ بڑھا ہوا ہے اور اللہ زبردست ہے اور تدبیر والا ہے۔

اسلام میں طلاق:

اسلام رشتۂ ازدواج کو ہمیشگی اور تسلسل کی بنیاد پر قائم کرتا ہے مگر تاریخ کے مختلف ادوار میں انسانی صورت حال ظاہر کرتی ہے کہ ازدواجی زندگی کبھی کبھی ناقابل برداشت جہنم بن جاتی ہے اور باہمی اختلافات وتنازعات کی وجہ سے یا رشتۂ ازدواج کو قائم وباقی رکھنے والے لوازمات کے فقدان کے نتیجہ میں اپنی بقاء وتسلسل کا جواز کھودیتی ہے۔ اسلام نے ازدواجی مسئلہ کے حل کے لئے ایک ایسا بے نظیر طریقہ اختیار کیا ہے جس میں امکانی حد تک ازدواجی زندگی کی بقاء کے ساتھ ساتھ عورت کے مزاج کی بھی بھرپور رعایت کی گئی ہے۔ اسی طرح اس میں مرد کے فرائض اور بچوں کے مصالح کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- زوجین کے درمیان اختلاف چونکہ ظاہر اور فطری ہے اس لئے اسلام نے دونوں کو صبر، رواداری اور خوش اسلوبی سے باہم مل جل کر رہنے کی تلقین کی ہے:

"وعاشروهن بالمعروف فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئاً ويجعل الله فيه خيراً كثيرا" (النساء: ۱۹/۴)، (اوران کے ساتھ اچھی طرح گزربسر کرو، اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو)۔

اوراختلاف کے شدت اختیار کرلینے کے نتیجہ میں اس کے حل کے لئے اسلام نے ایک خانگی عدالت یک تشکیل کا حکم دیا ہے: "و إن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكماً من أهله و حكماً من أهلها إن يريدا إصلاحا يوفق الله بينهما" (النساء: ۳۵/۴)، (اور

اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک منصف، مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک منصف، عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا)۔

۲- اگر یہ خانگی عدالت زوجین کے درمیان مصالحت میں کامیاب نہ ہو سکے تو اسلام نے شوہر کے لئے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو پہلی طلاق دے۔ یہ طلاق رجعی کہلاتی ہے۔ یعنی اس صورت میں مرد کے لئے جائز ہے کہ عدت کے دوران میں جو تین حیض ہیں، اپنی بیوی کو اپنے عقد نکاح میں لوٹا لے۔ یہ تین حیض کی مدت مطلقہ عورت اپنے شوہر کے گھر میں گزارے گی مگر زوجین ایک ساتھ نہیں رہیں گے۔ اگر ایک ساتھ رہنے لگیں گے تو طلاق کا اثر ختم ہو جائے گا اور ازدواجی زندگی پھر سے شروع ہو جائے گی، اس کے برعکس اگر شوہر نے عدت کے دوران میں اپنی مطلقہ کو اپنے عقد نکاح میں واپس نہ لوٹایا اور عدت گزر گئی تو یہ طلاق بائن ہوگی اور اس صورت میں زوجین پر لازم ہوگا کہ پوری طرح ایک دوسرے سے علاحدگی اختیار کر لیں۔

۳- اسلام نے جس طرح شوہر کو طلاق کا حق عطا کیا ہے اسی طرح بیوی کو بھی خلع کے مطالبہ کا حق عطا کیا ہے۔ اسلام نے عورت کو یہ حق بھی دیا ہے کہ وہ یہ شرط لگائے کہ اس کی عصمت اس کے اختیار میں ہوگی (وہ اپنی مرضی سے اپنے اوپر طلاق واقع کر سکے گی) نیز یہ کہ وہ شکایت کے ازالہ کے لئے اور طلاق کی درخواست لیکر عدالت میں جا سکتی ہے۔

۴- اگر زوجین عدت کے دوران میں یا عدت کے بعد ازدواجی زندگی میں واپس آ جائیں پھر دوبارہ ان کے درمیان اختلاف ہو جائے تو ان دونوں کے لئے سابقہ طریقہ ہی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس صورت میں اگر شوہر اپنی بیوی کو دوسری بار طلاق دے گا تو یہ طلاق رجعی ہی قرار دی جائے گی اور پہلی طلاق کی طرح اس صورت میں بھی عدت کے دوران میں یا عدت کے بعد زوجین کے لئے عقد نکاح میں لوٹ آنے کا امان برقرار رہے گا۔

۵- اگر زوجین دوبارہ ازدواجی زندگی میں لوٹ آئیں اور ان کے درمیان پھر اختلاف واقع ہو جائے تو دونوں سابقہ طریقہ ہی اختیار کرنا واجب ہوگا۔ اب اگر شوہر تیسری بار اپنی بیوی کو طلاق دے تو یہ طلاق آخری ہوگی، اس کے بعد رشتۂ ازدواج میں واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ اسے طلاق بائن بینونت کبری کہتے ہیں۔ یعنی اس کے بعد زوجین کے لئے جائز نہیں کہ ازدواجی زندگی میں واپس آئیں۔ اب سابقہ ازدواجی زندگی میں واپسی کی صرف یہی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ عورت کسی اور شوہر سے نکاح کرے اور اس دوسرے شوہر کے ساتھ رہ کر زندگی کا تجربہ کرے پھر اس شوہر کے انتقال کر جانے کی وجہ سے یا اس کی طرف سے طلاق دیئے جانے کی صورت میں یہ نکاح ختم ہو جائے اور وہ عورت اپنے سابق شوہر کے عقد نکاح میں آ جائے۔ اس صورت میں اس کا سابق شوہر ازسرنو اس کے سلسلہ میں تین طلاق کا مالک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**الطلاق مرتن فامساک بمعروف أو تسريح باحسان ولايحل لكم أن تأخذوا مما آتيتموهن شيئاً إلا أن يخافا أن لايقيما حدود الله فإن خفتم ألا يقيما حدود الله فلا جناح عليهما فيما افتدت به تلک حدود الله فلا تعتدوها ومن يتعد حدود الله فأولئک هم الظالمون فإن طلقها فلا تحل له م بعد حتى تنكح زوجاً غيره فإن طلقها فلا جناح عليهما أن يتراجعا إن ظنا أن يقيما حدود الله**" (البقرہ: ۲/ ۲۲۹-۲۳۰)، (طلاق دوبار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کے ساتھ رخصت کر دینا۔ اور تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے، اس میں سے کچھ لے لو مگر یہ کہ تم دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے، پھر اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ دونوں اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو دونوں پر گناہ نہیں اس مال میں جس وعورت فدیہ میں دے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں تو ان سے باہر نہ نکلو اور جو شخص اللہ کی

حدوں سے باہر نکل جائے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ عورت اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ مرد اس کو طلاق دے دے تب گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر مل جائیں بشرطیہ انہیں اللہ کی حدوں پر قائم رہنے کی توقع ہو)۔

تعدد ازدواج:

سابقہ تمام اقوام و مذاہب میں تعدد ازدواج بغیر کسی قید کے رائج رہا ہے۔ اسلام آیا تو اس نے شخص کو اس کا حق دار تسلیم کیا جو اس کا ضرورت مند ہو، اس کی استطاعت رکھتا ہو اور جسے یہ اعتماد ہو کہ وہ اپنی طرف سے عدل کر سکے گا: "**فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی و ثلاث و رباع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة**" (النساء: ۴؍۳)، (تو عورتوں میں سے حسب حال دو دو، تین تین، چار چار تک سے نکاح کرلو اور اگر تم کو اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی نکاح کرو)۔

اس زمانہ میں مرد و عورت کے درمیان مشینی برابری کی آوازیں بہت بلند ہونے لگی ہیں۔ موجودہ دور کے بہت سے شہری (Civil) قوانین میں تعدد ازدواج کو ایک قابل سزا جرم قرار دیا گیا ہے جب کہ ان ہی قوانین میں شادی کے دائرہ سے باہر مرد و عورت کے لئے جنسی زندگی گزارنے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ متعدد مرتبہ اسے شخصی حالات پیش آجاتے ہیں جن کی وجہ سے شوہر کے لئے ایک سے زائد شادی کا جواز پیدا ہو جاتا ہے بلکہ پیش آمدہ حالات میں کبھی کبھی ایسا کرنا سابقہ بیوی کے لئے باعث اعزاز و اکرام ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کی بیوی بانجھ ہو، بچہ جننے کی صلاحیت سے محروم ہو یا اسے کوئی ایسا مرض لاحق ہو جو ازدواجی تعلق میں مانع ہو یا شوہر شدت کے ساتھ اسے ناپسند کرتا ہو اور ثالثی کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہو چکی ہوں۔ اب ان جیسے حالات میں اگر شوہر چاہے تو اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر وہ ان تمام صورت حالات کے باوجود اپنی بیوی کو بہ عزت و احترام اپنے پاس رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسری عورت سے بھی شادی کر لیتا ہے تو یہ ایک شریفانہ اور بصیرت پر مبنی ایک عمل ہے۔ اس میں بھی کوئی دورائے نہیں کہ سابقہ بیوی کے لئے بھی یہ سب سے بہتر صورت ہے، اسی طرح دوسری عورت بھی اگر پہلی بیوی کی موجودگی میں اس مرد سے شادی کو منظوری دیتی ہے تو تعدادازدواج کو قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کی صورت حال میں تعدد ازدواج سے ایک ساتھ دونوں کے مصالح وابستہ ہیں۔

کبھی کبھی ایسے سماجی حالات پیش آجاتے ہیں کہ مردوں کی تعداد کم ہو جاتی اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہو جاتی ہے جیسا کہ جنگوں کے نتیجہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عورتوں کا تناسب مردوں سے بڑھ جاتا ہے۔ اسے حالات میں ایک عورت کے لئے شوہر کی ضرورت کی تکمیل اور معاشرہ کو اخلاقی مفاسد و رذائل سے محفوظ رکھنے کی خاطر تعدد ازدواج ایک اخلاقی اور انسانی فریضہ ہے۔

اس موقع پر ہم اس طرف بھی اشارہ کرتے چلیں کہ تمام اقوام اور تاریخ کو تمام ادوار کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ عام حالات میں ہمیشہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ اضافی تناسب عموماً ۳% (تین فیصد) سے زائد نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دو مرد کے لئے ایک عورت پیدا کرتا ہے۔ یہی اصل ہے۔ اس صورت میں کچھ عورتیں بغیر شادی کے بچ جاتی ہیں۔ اب ان کی شادی کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بعض مرد ایک سے زائد شادی کریں۔ اس صورت حال میں اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہ ہو تو کیا کیا جائے گا اور اس مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے گا؟

جس ہستی نے مرد وعورت کی تخلیق کی ہے، اسی نے تعدد ازدواج کا قانون بھی وضع کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون سازی اس کی تخلیق کردہ صورت حال سے نمٹنے ہی کے لئے ہوتی ہے، لہٰذا ایک طرف یہ صورت حال اور دوسری طرف یہ قانون دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں: "ألا له الخلق و الأمر تبارک الله و ر ب العالمین" (الأعراف: ۷/۵۴)، (اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم کرنا، بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہاں کا)۔

اگر مسلمان کبھی کبھار تعدد ازدواج کے اس قانون کا غلط استعمال کرتے ہوئے شرائط وضوابط کی پابندی کے بغیر اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں تو اس صورت حال کا حل یہ ہے کہ انہیں اس کا پابند کیا جائے نہ کہ سرے سے قانون تعدد ازدواج ہی کو کالعدم قرار دے دیا جائے، کیونکہ اس کے نتیجہ میں عورت اور سماج دونوں کو سنگین ضرر لاحق ہوگا۔

والدین اور اولاد:

اسلام والدین اور اولاد کے باہمی تعلق کو اس اصول کے تحت منضبط کرتا ہے کہ والدین کی طرف سے مادی، جذباتی اور اخلاقی سطح پر اولاد کی کامل کفالت واجب ہے اور اولاد کی طرف سے والدین کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک لازم ہے۔ اولاد کی کفالت میں ان کو کم سے کم لازمی تعلیم کے قابل بنانا شامل ہے، اتنی لازمی تعلیم جس کے وہ شوقین اور اہل ہوں۔ اسی طرح ماں اور بچہ کی کفالت سماج اور حکومت پر لازم ہے خصوصاً یتیم اور لاوارث بچہ نگہداشت۔

قرآن وسنت نے یتیم ومسافر کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے اور زکاۃ، صدقات، غنائم اور فئ میں ان کا حق مقرر کیا ہے۔ خاندان اس چھوٹے سے کنبہ کا نام نہیں ہے جس میں صرف زوجین اور ان کے بچے ہوں، باقی کوئی نہ ہو۔ اسلام کی نظر میں خاندان کا دائرہ ایک شخص کے والدین کے رشتہ داروں (عصبات، ذوی الأرحام) اور قرابت داروں تک وسیع ہے۔ اللہ کے دین کی رو سے ان کے ساتھ صلہ رحمی فرض ہے اور ان سے رشتہ توڑنا کبیرہ گناہ ہے: "وأولو الأرحام بعضهم أولى ببعض فى كتاب الله" (الأنفال: ۸/۷۵)، (اور خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کے نوشتہ میں)۔

"واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً و بالوالدين إحساناً و بذى القربى" (النساء: ۴/۳۶)، (اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ اور اچھا سلوک کرو ماں باپ کے ساتھ اور قرابت داروں کے ساتھ)۔

اسلام اور سماج:

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام سماج کو افراد و معاشرہ کے درمیان اخوت ووحدت کے مضبوط ستونوں پر قائم کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں نہ قومیتوں اور مذاہب کے درمیان کوئی کشمکش ہوتی ہے اور نہ طبقات ومسالک کے درمیان کوئی جنگ، سب کے سب بھائی ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان قدر مشترک اللہ کا بندہ ہونا اور آدم کا بیٹا ہونا ہوتا ہے: "تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک" (مسند احمد، کتاب مسند الأنصار، باب حدیث رجل من أصحاب النبیؐ، حدیث نمبر: (۲۲۳۹۱)۔ یہ حدیث مرفوع ہے اور اس کے راوی حضرت ابونضرہ ہیں۔ اس حدیث کے سلسلۂ روایت میں ایک راوی مستور الحال ہیں اور اس حدیث کی روایت میں امام احمد منفرد ہیں)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام سماج کے کمزور طبقات مثلاً مزدور، کسان، اہل ہنر اور کم عمر ملازمین پر جن کو کمزور سمجھ کر لوگ ان کا خیال نہیں رکھتے، غیر معمولی توجہ دیتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے ان کی پذیرائی فرمائی ہے اور انہیں حالت امن میں پیداواری عمل کی اساس نیز حالت جنگ

میں مدد کرنے والا ہتھیار قرار دیا ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے: ''تمھیں اپنے کمزوروں ہی کی بہ دولت رزق ملتا ہے اور ان ہی کی وجہ سے تمہاری مدد ہوتی ہے'' (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب من استیعان بالضعفاء، حدیث نمبر (۲۶۸۱)، بہ روایت حضرت سعد بہ الفاظ ''ہل ترزقون وتنصرون''۔ سنن الترمذی کتاب الجہاد عن رسول اللہؐ، باب ما جاء فی الاستفتاح بصعالیک المسلمین، حدیث نمبر: (۱۶۲۳) اس روایت میں یہ اضافہ ہے: ''ابغونی الضعفاء''۔ سنن أبی داؤد۔ کتاب الجہاد، باب الاختصار برذل الخیل والضعفة، حدیث نمبر: (۲۲۲۷) بہ روایت حضرت ابوالدرداء)۔

جاہلی معاشروں میں یہ کمزور طبقات نظر انداز کردیئے جاتے تھے مگر اسلام نے اپنی آمد کے بعد ان میں سے ہر ایک کی جسمانی طاقت، اس کی محنت اور اس کی ضرورت تینوں پہلوؤں کو بیک وقت پیش نظر رکھتے ہوئے معروف کے مطابق منصفانہ تنخواہوں اور تحفظاتی اقوامات کے ذریعہ ان کے حقوق محفوظ کئے۔ اسی طرح اسلام نے ان ناداروں، مسکینوں، یتیموں اور مسافروں کا بہ طور خاص خیال رکھا ہے جو محنت کی طاقت نہیں رکھتے یا محنت کی طاقت رکھتے ہوئے روزگار سے محروم ہیں یا محنت کے باوجود انہیں اتنی مزدوری نہیں مل پاتی ہے کہ اس سے ان کے اخراجات پورے ہوں۔ اسلام نے انہیں اصحاب حیثیت افراد، کے اموال اسی طرح اجتماعی اموال جیسے غنائم اور فئی نیز دیگر حکومتی ذرائع آمدنی میں ان طبقات کے لئے میقاتی اور غیر میقاتی حقوق (مثلاً زکوۃ وغیرہ) متعین کئے ہیں تاکہ افراد معاشرہ کے درمیان اجتماعی معاشی کفالت کا نظام بروئے کار لایا جاسکے، طاقتور کمزور کی دست گیری کرسکے، خوش حال نادار کی نفع رسانی کا ذریعہ بن سکے اور سرمایہ مالداروں کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر صرف ان ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''ما أفاء اللہ علی رسولہ من أہل القری فللہ وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیل کی لا یکون دولۃ بین الأغنیاء منکم'' (الحشر: ۵۹/ ۷)۔ (جو کچھ اللہ اپنے رسول کو بستیوں والے کی طرف سے لوٹائے تو وہ اللہ کے لئے ہے اور رسول کے لئے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے تاکہ وہ تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے)۔

مسکین، مسافر اور یتیم جو کچھ ان مدات میں سے حاصل کرسکیں گے وہ ایک طے شدہ حق اور قابل احترام فریضہ ہے۔ یہ کسی کی طرف سے نہ از راہ احسان ہے اور نہ رضا کارانہ بلکہ اسلامی حکومت اپنے نمائندوں کے ذریعہ ان مدات کے تحت مال داروں سے مال وصول کرے گی اور اپنے غریب عوام پر صرف کرے گی۔ اگر کوئی شخص اپنی رضا ورغبت سے یہ فریضہ ادا نہیں کرے گا تو اس سے جبراً ادا کروایا جائے گا خواہ تلوار کی نوک ہی پر کیوں نہ ہو۔ اسلامی حکومت دنیا کی وہ پہلی حکومت ہے جو غریبوں کے حقوق کے لئے جنگ کرتی ہے۔ اسلام کے خلیفۂ اول کا بیان ہے: ''بہ خدا اگر یہ مجھے اونٹ کی وہ رسی بھی دینے سے انکار کریں گے جو رسول اللہؐ کے عہد میں دیا کرتے تھے تو میں اس کی خاطر ان سے جنگ کروں گا'' (صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب الاقتداء بسنن الرسول، حدیث نمبر: (۶۷۴۱) بہ روایت حضرت ابو ہریرہ، صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا إلہ إلا اللہ محمد رسول اللہ، حدیث نمبر: (۲۹) ب روایت حضرت ابو ہریرہ)۔

اسلام کی کوشش ہے کہ امیر وغریب کے درمیان خلیج کم ہو، اس لئے وہ ایک طرف امیروں کی حد سے بڑھی ہوئی آمدنی پر لگام لگاتا ہے اور دوسری طرف غریبوں کا معیار زندگی بلند کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کے لئے یہ صورت حال ناقابل قبول ہے کہ ایک شخص آسودہ ہوکر کھائے اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔ اسلام ان طبقات کی کفالت کا براہ راست ذمہ دار حکومت کو ٹھہراتا ہے۔ اس کی نظر میں سربراہِ حکومت نگراں اور اپنے ماتحتوں کے متعلق جواب دہ ہے۔ وہ عوام کے لئے ایسا ہی ہے جیسے خاندان کے لئے باپ۔

آپؐ کا ارشاد ہے: میں اہل ایمان سے خود ان کی ذات سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ اگر کسی کی موت ہوجائے اور اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کی ادائیگی میری ذمہ داری ہے، لیکن اگر کوئی شخص مال چھوڑ کر مرے تو اس کے حق دار اس کے وارث ہیں'' (صحیح مسلم، کتاب الفرائض، بہ

روایت حضرت ابو ہریرہ)۔

ہمارا ایما ہے کہ صالح معاشرہ کی تشکیل قوانین کے ذریعہ خواہ وہ کتنے ہی منصفانہ اور ارفع ہوں، نہیں ہوسکتی، صالح معاشرہ کی تشکیل تسلسل کے ساتھ جاری تعلیم وتربیت اور بصیرت پر مبنی رہنمائی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اسی لئے اسلام جتنی توجہ قانون سازی اور وضع اصول پر مرکوز کرتا ہے، اتنی ہی بلکہ اس سے کہیں زیادہ توجہ وہ تعلیم وتربیت اور رہنمائی پر دیتا ہے۔ ہر بیداری اور تبدیلی کی بنیاد صاحب فکر وضمیر اور حامل ایمان واخلاق انسان کی تعمیر وتربیت ہے۔ یہی صالح انسان ایک صالح معاشرہ کی اساس ہوتا ہے۔

وہ صالح انسان ہی ہے جسے سورۂ عصر میں نجات یافتہ قرار دیا گیا ہے: "**والعصر إن الانسان لفی خسر إلا الذین آمنوا و عملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصو بالصبر**" (العصر:۱۰۳/۱-۳)، (قسم ہے زمانہ کی، بے شک انسان گھاٹے میں ہے مگر جولوگ کہ ایمان لائے اور نیک عمل کیا اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی)۔

ایک مثبت فکر کا حامل انسان ایمان وعمل دونوں کا جامع ہوتا ہے، وہ اپنی اصلاح پر بھی توجہ دیتا ہے اور دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی کوشاں ہوتا ہے۔ وہ حق اور صبر کے حوالے سے خود بھی دوسروں کی رہنمائی کو قبول کرتا ہے اور دوسروں کو بھی حق اور صبر کے سلسلہ میں اپنی رہنمائی سے نوازتا ہے۔ مسلمان معاشرہ میں کوئی شخص اتنا چھوٹا نہیں کہ دوسروں کو نصیحت نہ کرسکے اور نہ کوئی شخص اتنا بڑا ہے کہ اسے نصیحت نہ کی جاسکے۔

اسی لئے عالمی اتحاد برائے اہل اسلام کا موقف ہے کہ نرسری سے یونیورسٹی سطح تک کے تعلیمی اداروں پر بھرپور توجہ صرف کی جائے تاکہ مسلمان نسلوں کو علم کے ساتھ ساتھ ایمان سے، ہنر کے ساتھ ساتھ اخلاق سے اور عقل ودماغ کو روشن کرنے والی ثقافت کے ساتھ ساتھ دلوں کے تزکیہ کا سامان کرنے والے تقوی سے بھی آراستہ کیا جاسکے۔ اسی طرح جیسے صالح نظام تعلیم، صالح کتب، صالح معلمین، صالح انتظامیہ، اعلیٰ اور بہتر تعلیم میں معاون تعلیمی ماحول۔

اسلام کو جو تعلیم مطلوب ہے وہ ایک ہمہ جہت تعلیم ہے، جس کے تحت ایک مسلمان کی روحانی، عقلی، وجدانی، اخلاقی، جسمانی، لسانی، سماجی، سیاسی، اقتصادی، عسکری اور جنسی الغرض ہر سطح پر تربیت اور رہنمائی ہوسکے۔ اس تربیت کے نتیجہ میں جس مسلمان شخصیت کی تشکیل ہوگی اس کے اخلاق کا آئینہ قرآن ہوگا اور اس کا اسوہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔

مسلمان نسلوں کے لئے مطلوبہ تعلیم کے اہم نشانات راہ یہ ہیں کہ وہ خرافات سے پاک عقائد اور شرک سے پاک توحید کو اختیار کریں، آخرت پر اعتماد کی قوت سے لیس ہوں، پاکیزہ اخلاق، راست بازی، عمل کی درستگی، ادائے امانت، ایفائے عہد، عدل، حسن سلوک، نرمی، ہمدردی، خیر پسندی، حیاء، پاک دامنی، خاکساری، غیرت، اظہار حق، مخالفت باطل، امور دین میں مصح وخیر خواہی کی صفات سے متصف، دل سے منکر کے ازالہ نیز ظلم وجارحیت سے مقابلہ میں استقامت کا مظاہرہ کریں اور استبداد کے آگے سرنگوں نہ ہوں خواہ اس کی پشت پر فرعون جیسی سلطنت اور قارون جیسی دولت ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح ذرائع ابلاغ کے اداروں اور الیکٹرانک وپرنٹ ہر طرح کے میڈیا پر گہری توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ آج کے دور میں ان ہی ذرائع سے افکار وخیالات، دلچسپیوں، رجحانات اور رائے عامہ کی تشکیل کا کام لیا جاتا ہے۔ لہذا ان ذرائع کو عقیدہ سے متصادم خیالات اور فکر وعمل میں فساد پیدا کرنے والے رجحانات سے پاک کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ گمراہ کن اور ہیجان انگیز پروپیگنڈے سے گریز کرتے ہوئے منصوبہ بند اور منتخب پروگراموں کے ذریعہ جن کی بنیاد خیر میں حق گوئی رہنمائی میں درستگی، تفریح میں اعتدال

اوراعلیٰ قدروں کی پابندی نیز تمام قسم کے پروگراموں میں کامل ہم آہنگی پر ہو، ان ذرائع ابلاغ کے اداروں کو سماج کے عظیم مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

اسلام اور معیشت:

انسان کے بہ حیثیت فرد یا معاشرہ بہت طرح کے تقاضے ہیں۔ ان میں سے بعض ضرورت کے درجہ کے ہیں جن کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے۔ بعض حاجت کے درجے کے ہیں جن کے بغیر تھوڑی تکلیف کا سامنا کرے حسن عطا کرتے اور اسے پُر لطف بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس کائنات میں پھیلے بہت سے فطری ذرائع رکھے ہیں جن کو اس نے انسان کے لئے مسخر کر دیا ہے اور اسے ان کے استعمال پر قادر بنایا ہے۔

جس قوم کے وسائل و ذرائع اس کی ضروریات سے زیادہ ہوتے ہیں وہ معاشی طور پر خوش حال ہوتی ہے اور جس کی ضروریات اس کے وسائل کے مقابلے زیادہ ہوتی ہیں وہ اقتصادی بحران کا سامنا کرتی ہے۔ اس اقتصادی بحران کا حل ضروری ہوتا ہے ورنہ زوال اور اضطرار کے نتیجہ میں وہ دوسرے ممالک سے قرض و تعاون لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ صاف ستھرے اقتصادی اقدامات کے ذریعہ اس صورت حال کا تدارک نہیں ہوتا۔

آج عالم اسلام اپنی ضروریات سے فاضل بے پناہ فطری وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود بہت بڑے اقتصادی بحران سے دو چار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں اپنے وسائل سے بہ حسن و خوبی فائدہ اٹھانے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ یہ سنگین اقتصادی پس ماندگی بیش تر مسلم ممالک پر مسلط سیاسی پس ماندگی کا نتیجہ ہے۔

اول: اسلام کا اقتصادی نقطۂ نظر:

۱- فرد و معاشرہ کی اقتصادی سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں اور اقتصادی مسائل کے حل کے حوالے سے اسلام کا نقطۂ نظر دراصل انسان اور اس کائنات میں اس کے کردار کے متعلق اس کے عمومی نقطۂ نظر ہی کا ایک حصہ ہے۔ اسلام کا یہ نقطۂ نظر عقائد، اخلاقی اقدار اور ان تشریعی احکام کی صورت میں موجود ہے جو انسانی زندگی کی تنظیم کرتے ہیں۔ ان میں سے بیش تر براہ راست اقتصادی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کا یہ عقیدہ کہ اس کا رزق اللہ کے ہاں مقدر ہے، اس کا تلاش معاش کی جد و جہد میں اللہ پر توکل، اس کا حرام سے بچتے ہوئے غربت پر صبر، اس کا ایمان کہ وہ زمین میں خدا کا نمائندہ ہے اور اس سے زمین کی آبادکاری مطلوب ہے، اسی طرح عوام کے درمیان عدل کی اقدار کا فروغ، ان کے یکساں مواقع کی فراہمی، سربراہ حکومت کی یہ ذمہ داری کہ وہ شوری کے ذریعہ عوام کے مسائل حل کرے نیز ظلم، رشوت، سود اور غرر پر مکمل پابندی، ان سب کا امت کے اقتصادی مسائل کے حل میں ایک کردار ہے۔

ایک اہم مسئلہ جس کی توضیح اس مقام پر ضروری ہے، یہ ہے کہ دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی ترجیح محنت، پیداواری عمل اور طیبات سے استفادہ کے منافی نہیں بشرطیکہ وہ اسراف سے بچتے ہوئے ہو۔ آپ ؐ کا ارشاد ہے: ’’بہتر مال وہ ہے جو بہتر آدمی کی ملکیت میں ہو‘‘ (مسند احمد، کتاب مسند الشامیین، باب حدیث عمرو بن العاص، حدیث نمبر: (۱۷۰۹۶)۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ صحیح ابن حبان، کتاب الزکاۃ، باب ذکر الإباحۃ للرجل الذی یجمع المال من حلہ، حدیث نمبر (۳۲۱۰)۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں)۔

آپ ؐ نے یہ بھی فرمایا ہے: ’’دنیا سے بے رغبتی اور زہد یہ نہیں کہ حلال کو حرام قرار دے دیا جائے یا مال کو ضائع کر دیا جائے بلکہ دنیا کا

زہد یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے قبضہ واختیار میں ہے اس پر تمہارا اعتماد اللہ کے قبضہ واختیار میں موجود اشیاء پر تمہارے اعتماد سے نہ بڑھ جائے'' (سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب الزہد فی الدنیا، حدیث نمبر: (۴۰۹۰)، یہ روایت حضرت ابوذر، سنن الترمذی، کتاب الزہد، باب ما جاء الزہادۃ، حدیث نمبر: (۲۲۶۲) بہ روایت حضرت ابوذر۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے، اس کے ایک راوی عمرو بن واقد ہیں جن کو امام بخاری نے ''منکر الحدیث'' قرار دیا ہے)۔

العزّ بن عبدالسلام فرماتے ہیں: ''کسی چیز کے حوالے سے زہد یہ ہے کہ دل اس سے بے رغبت اور لاتعلق ہو کر اس کے میلان سے خالی ہو جائے، اس کے لئے ہاتھ کا اس چیز سے خالی ہونا یا اس کی ملکیت سے منقطع ہونا ضروری نہیں۔ رسولوں کے سردار اور زاہدوں کے امام حضرت محمدؐ کا وصال اس حال میں ہوا کہ آپؐ فدک، مضافات مدینہ اور نصف مکہ مکرمہ سمیت خیبر کے متعدد حصص کے مالک تے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام پوری روئے ارض کے مالک تھے اور ان دونوں ہستیوں کا اپنی مملوکہ اشیاء سے تعلق ان کے تعلق مع اللہ میں مزاحم نہیں تھا (قواعد الاحکام فی مصالح الأنام للعزّ بن عبدالسلام ۱/۱۶۱۔ مؤسسۃ الریان۔ بیروت)۔

اللہ تعالیٰ نے تو مسلمان کے لئے طیبات کی تلاش وجستجو کو مشروع قرار دیا ہے اور ان کو حرام قرار دینے سے منع فرمایا ہے: ''**یا أیھا الذین آمنوا لاتحرموا طیبات ما أحل الله لکم ولا تعتدوا إن الله لایحب المعتدین وکلوا مما رزقکم الله حلالاً طیباً**'' (المائدہ: ۵/۸۷-۸۸)، (اے ایمان والو! ان ستھری چیزوں کو حرام نہ ٹھہراؤ جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے تم کو جو حلال اور پاکیزہ چیزیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ)۔

دوم: اقتصادی سرگرمیوں کے متعدد مراحل:

پہلا مرحلہ- پیداواری: اس کے تین عوامل ہیں:

الف: زمین: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ھو أنشأ لم من الارض واستعمر کم فیھا**'' (ہود: ۱۱/۶۱)، (اسی نے تم کو زمین سے بنایا اور اس میں تم کو آباد کیا)۔

آپؐ کا فرمان ہے: ''جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو کھیتی کے لئے دے دے'' (صحیح البخاری، کتاب المزارعۃ، باب ما کان من أصحاب النبی، حدیث نمبر: (۱۲۲۱۶)، بہ روایت حضرت جابر۔ مسلم، کتاب البیوع، باب کراء الأرض، حدیث نمبر (۱۵۳۶)، بہ روایت حضرت جابر)۔

آپؐ نے فرمایا: ''اگر قیامت آیا ہی چاہتی ہو اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کھجور کا ایک چھوٹا سا پودا ہو اور قیامت کی آمد سے قبل وہ اسے زمین میں لگا سکتا ہو تو ضرور لگا دے'' (مسند احمد، کتاب باقی مسند المکثرین، باب باقی مسند السابق، حدیث نمبر (۲۵۱۲)، بہ روایت حضرت انس، ابن حدیث روایت تنہا امام احمد نے کی ہے۔ اس کے راوی ثقہ ہیں)۔

آپؐ کا ارشاد ہے: ''جو کسی بنجر زمین کو قابل کاشت بنائے وہ اسی کی ہوگی'' (سنن أبی داؤد، کتاب الخراج والإمارۃ، باب فی احیاء الموات، حدیث نمبر (۳۰۷۳)، بہ روایت حضرت سعید بن زید سنن الترمذی، کتاب الاحکام عن رسول اللہ، باب ما ذکر فی إحیاء أرض الموات، حدیث نمبر (۱۲۹۹) بہ روایت سعید بن زید۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے)۔

ب: محنت: آپؐ نے فرمایا: ''کسی نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے زیادہ بہتر کوئی کھانا نہ کھایا، اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی محنت سے کھاتے تھے'' (صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ حدیث نمبر: (۱۹۶۶)، بہ روایت حضرت مقدام، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب الحث علی المکاسب حدیث نمبر: (۲۱۲۹)۔

''جب تم میں سے کوئی شخص کسی کام کو بہ حسن وخوبی انجام دیتا ہے تو اللہ اسے پسند کرتا ہے'' (الطبرانی: الأوسط، حدیث نمبر: (۸۹۷) بہ روایت حضرت عائشہ، ہیثمی، مجمع الزوائد، کتاب البیوع باب نصح الأجیر وإتقان العمل، حدیث نمبر: (۶۴۶۰)، بیہقی: شعب الإیمان، حدیث نمبر: (۵۳۱۲)، مسند أبی یعلی، مسند عائشہ رضی

اللہ عنہا، حدیث نمبر: (۴۳۸۶)، سیوطی: الجامع الصغیر، حدیث نمبر: (۱۸۸۰)۔ شیخ البانی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)۔

ج - مال: مال پیداواری عمل میں ایک بنیادی عنصر ہے۔ اسی لئے اسلام نے اسے جمع کرنے پر پابندی عائد کی ہے اور جائز ذرائع سے اس کی سرمایہ کاری نیز راہ خدا میں اسے خرچ کرنے پر ابھارا ہے: "**والذین یکنزون الذهب والفضة ولاینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب ألیم**" (التوبۃ: ۹/ ۳۴)، (اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو)۔

کسی مال سے زکاۃ کی ادائیگی کے بعد اس کا شمار کنز میں نہیں ہوگا، لیکن اس کے باوجود اسلام کی نظر میں ترجیحی صورت یہ ہے کہ اس مال کو گردش میں رکھا جائے اور اس کی سرمایہ کاری کی جائے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "یتیموں کے مال کو تجارت میں لگاؤ تا کہ وہ زکاۃ ادا کرتے کرتے ختم نہ ہو جائے" (الطبرانی: المعجم الأوسط، حدیث نمبر: (۴۱۵۲)، بہ روایت انس بن مالک، کنز العمال للمتقی الہندی، حدیث نمبر: (۴۰۴۸۴)، بہ روایت حضرت انس، ہیثمی: مجمع الزوائد، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الأموال للیتیم حدیث نمبر: (۴۳۵۹)، (ہیثمی کہتے ہیں: اس روایت کی سند صحیح ہے۔ سیوطی: الجامع الصغیر، باب حرف الألف، حدیث نمبر: (۹۶) بہ روایت حضرت انس)۔

جہاں تک پیداواری عمل کے وسائل و ذرائع اور اس کے متنوع طریقوں کا تعلق ہے تو انہیں انسانی فکر، علوم و معارف کے ارتقاء اور زمان و مکان کے اختلاف پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس حوالے سے صرف ایک شرعی پابندی یہ عائد کر دی گئی ہے کہ پیداواری عمل لوگوں کے لئے مفید، جائز اور پاکیزہ ذرائع ہی سے ہونی چاہئے اور انسانوں کے جسم یا ان کی عقلوں کو ضرر پہنچانے والی ناپاک اشیاء کی پیداواری سے مکمل طور پر گریز کیا جائے یعنی فقہاء کے بہ قول ہر وہ عمل ممنوع ہے جو کسی فساد کے درآنے کا یا کسی صلاح کے متاثر ہونے کا ذریعہ بنے"۔

دوسرا مرحلہ: تبادلہ:

انسان اپنی ضرورت کی ہر چیز پیدا نہیں کرتا۔ وہ عموماً اپنی ضرورت کی بعض چیزیں ہی پیدا کر پاتا ہے۔ اس لئے یہ فطری بات ہے کہ وہ دوسروں کی اضافی پیداوار سے اپنی اضافی پیداوار کا تبادلہ کرے۔ اگر ایسا نہ ہو تو لوگ برباد ہو جائیں اور ہر شخص تمام کام یا بیش تر کام خود ہی کرنے پر مجبور ہو۔ (قواعد الأحکام فی مصالح الأنام: ۱/ ۲۳۵، ۶۸/۲)۔

یہ تبادلہ ہی تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مشروع قرار دیا ہے: "**یا أیها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم**" (النساء: ۴/ ۲۹)۔ (اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے)۔

تجارت جائز ہے یہاں تک کہ حج کے موقع پر بھی۔ اس سے حاجی کے اجر میں کمی واقع نہیں ہوتی: "**لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسم الله**" (الحج: ۲۲/ ۲۸)، (تا کہ وہ اپنے فائدے کی جگہوں پر پہنچیں اور اللہ کا نام لیں)۔

لوگوں کے درمیان اشیاء اور منافع کا تبادلہ کسی ذریعہ کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ لوگ زمانۂ قدیم سے نقود (Currences) کو تبادلہ کا ذریعہ مانتے آئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی سونے اور چاندی کی کرنسیاں ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد لوگ مختلف اقسام کی کرنسیوں پر متفق ہو گئے اور فقہاء خلقی کرنسیوں جیسے سونے، چاندی اور اصطلاحی کرنسیوں جیسے پیسے وغیرہ اور موجودہ دور کے کاغذوں نوٹوں کے درمیان فرق کرنے لگے۔

تبادلہ عام طور پر بازار کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔ اقتصادی سرگرمیوں میں تبادلہ کی اہمیت ہی کے پیش نظر موجود دور کے اقتصادی نظام کو ''بازار کی اقتصادیات'' (Market Economy) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد لوگوں کے درمیان تبادلہ اور فطری مقابلہ کی آزادی پر مبنی اقتصادی نظام ہے۔

اسلام کی نظر میں اصل چیز بازار کی آزادی ہے۔ یہاں حکومت کی خداخلت اگر جائز ہے تو وہ صرف اور صرف آزادانہ مقابلے کو یقینی اور محفوظ بنانے کے لئے۔

اسی لئے اسلام نے ذخیرہ اندوزی اور سود کو حرام اور فریقین کے درمیان کامل رضامندی کو فرض قرار دیا ہے۔ "إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم" (النساء: ۴/۲۹)۔ (مگر یہ کہ تجارت ہو آپس کی خوشی سے)۔

اسلام میں کسی کو مجبور کر کے اس سے خرید وفروخت یا کسی مجبور سے خرید وفروخت، اسی غرر پر مبنی بیع وشراء ممنوع ہے۔ کیونکہ ان معاملات میں طرفین کے درمیان کامل رضامندی نہیں پائی جاتی اور نہ ان میں فریقین کے حقوق واضح ہوتے ہیں۔ اشیاء کی کمی سے پیدا شدہ گرانی کو کنٹرول کرنے کے لئے کی جانے والی نرخ کی تعیین کو آپؐ نے ممنوع قرار دیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ ہی نرخوں کا تعین زمانے والا، رزق میں تنگی کشادگی پیدا فرمانے والا اور رزق عطا فرمانے والا ہے۔ میں اللہ تعالیٰ کا سامنا اس حال میں کرنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی کسی خون یا کسی مال کے سلسلہ میں میرے خلاف کوئی شکایت لے کر وہاں حاضر نہ ہو'' (سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی التسعیر، حدیث نمبر: (۱۲۳۵) بہ روایت حضرت انس، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح قرار دیا ہے۔ سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی التسعیر، حدیث نمبر: (۳۴۵۱)، بہ روایت حضرت انس، سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، باب من کرہ أن یسعر، حدیث نمبر: (۲۱۹۱)، بہ روایت حضرت انس)۔

البتہ جہاں انصاف کا تقاضہ ہو وہاں آپ نے نرخوں کے تعیین کو جائز قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو کسی غلام سے متعلق اپنا حصہ آزاد کرے اور اس کے پاس غلام کی قیمت کے برابر مال ہو تو اس کے حصہ کا تعین انصاف کے ساتھ کیا جائے گا'' (صحیح البخاری، کتاب العتق، باب إذا أعتق عبداً، حدیث نمبر: (۲۶۸۶)، بہ روایت حضرت ابن عمر، مسلم، کتاب الایمان، باب من أعتق شرکاً لہ فی عبد، حدیث نمبر: (۱۵۰۱)، بہ روایت حضرت ابن عمر)۔

حدیث میں مذکور حصہ کے تعین سے مراد اس کی منصفانہ قیمت اور صحیح نرخ کا تعین ہے۔

اسی لئے جمہور فقہاء نے مختلف حالات کے پیش نظر حکمراں کے لئے نرخ کے تعین میں مداخلت کے حق کو تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے۔ بعض نے اس کے دائرہ کو تنگ کیا ہے اور بعض اسے وسیع کیا ہے۔

تیسرا مرحلہ: تقسیم:

اس سے ہماری مراد بیداوار کے درج ذیل عناصر پر آمدنی کی تقسیم ہے:

اول: زمین:

اگر کوئی زمین کا مالک اپنی زمین میں کاشت کاری کرے تو اس کی پیداوار کا حق دار بھی وہی ہوگا۔ اس لئے کہ آپؐ نے فرمایا ہے: ''جس نے کسی بنجر زمین کو قابل کاشت بنایا وہ اسی کی ہے'' (اس روایت کی تخریج پیچھے گزر چکی ہے)۔

البتہ اگر زمین کا مالک اپنی زمین کسی شخص کو اجارہ پر دے دے یا کسی کے ساتھ اس میں شرکت کا معاملہ کرے تو زمین کے اجارہ یا زمین کی مزارعت یا اس کی بٹائی سے متعلق معاملات میں طے شدہ معاہدہ کے مطابق ان میں سے ہر ایک کا حق ہوگا۔

دوم: محبت:

مزدور رکھنے والے اور مزدور کی باہمی رضامندی سے محنت کرنے والے کی اجرت کا تعین ہوگا۔ آج کے زمانہ میں مزدوروں کا استحصال روکنے کے لئے دنیا کے بیش تر ممالک میں مزدوری کی کم سے کم حد کے تعین کا طریقہ رائج ہے اور اس کے نتیجہ میں اقتصادی سرگرمیوں میں ایک طرح کا استحکام پیدا ہوگیا ہے۔ ہمارا موقف ہے کہ اس کا تعین مسلمان سربراہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ یہ لوگوں کے درمیان عدل کے قیام اور ظلم کو روکنے کے حوالے سے اس کی ذمہ داری کا ایک حصہ ہے۔

مزدوری کی کم سے حد کا تعین فرض ہے تاکہ اس کے ذریعہ مزدور اور اس کے اہل وعیال کی ضرورت پوری ہوسکے۔ اس سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن حاطب کی اس روایت سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ان کے والد کے مزدوروں نے ان کے گاؤں کے ایک شخص کی اونٹنی چرا کر اسے ذبح کردیا تھا اور اس کا اقرار بھی کرلیا تھا۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اس مسئلہ میں چوری کرنے والوں کے ہاتھ کاٹنے کا حکم جاری کرکے پھر رجوع کرلیا اور فرمایا: ''اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم ان مزدوروں کو بھوکا رکھو گے اور وہ اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کے استعمال پر مجبور ہوں گے تو میں ان کے ہاتھ کاٹ دیتا۔

لیکن خدا کی قسم اگر میں ان کو چھوڑ دوں گا تو تم پر ایسا جرمانہ ضرور عائد کردوں گا جو تم کو بے چین کردے (سنن البیہقی، کتاب السرقۃ، باب ما جاء فی تضعیف الغرامۃ، حدیث نمبر: (۱۷۰۶۴)، بہ روایت حضرت عبدالرحمٰن بن حاطب)۔

سوم: سرمایہ (بہ شکل اشیاء یا نقد):

اشیاء کی صورت میں موجود سرمائے جیسے عمارتوں، مشینوں، گاڑیوں اور اوزار وغیرہ کو متعین کرایہ پر دیا جاسکتا ہے۔ یہ چیزیں کسی کمپنی کا حصہ بھی ہوسکتی ہیں اور اس صورت میں ان چیزوں کا مالک کمپنی میں ایک متعین حصہ کا حق دار ہوگا۔

جہاں تک نقدی سرمائے کا تعلق ہے تو اسے کسی حال میں کرایہ پر دینا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں کرایہ عین ربا (سود) ہے جس کا حرام ہونا قطعی ہے۔ اس سرمائے میں کام کی بنیاد پر شراکت ہوسکتی ہے جیسا کہ مضاربت کی صورت میں ہوتا ہے کہ اس میں ایک شریک مال پیش کرتا ہے اور دوسرا شریک اپنی محنت پیش کرتا ہے اور نفع طے شدہ معاہدہ کے مطابق شرکاء کے درمیان مشترک طور پر تقسیم ہوتا ہے۔

تیسرا مرحلہ: صرف:

پیداواری عمل کا بنیادی مقصد لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ یہ ضرورت اسی طرح پوری ہوسکتی ہے کہ پیداوار صرف ہو۔ صرف کے متعین فطری ضابطے ہیں جن کی لوگ خود ہی پابندی کرتے ہیں۔ اسلام نے بھی اس کے لئے چند شرعی ضوابط مقرر کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام نے فضول خرچی اور ضروری خرچ میں تنگی دونوں کو ممنوع قرار دیا ہے: ''**ولا تجعل يدک مغلولة إلى عنقک ولا تسبطها كل البسط**'' (الإسراء: ۱۷/۲۹)، (رونہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو)۔

''**وكلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لايحب المسرفين**'' (الأعراف: ۷/۳۱)، (اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

اسلام نے لوگوں کی ضروریات کی تکمیل کے درمیان ترتیب رکھی ہے، چنانچہ ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے: ''سب سے پہلے اپنی

ذات پر خرچ کرو، اس سے فاضل ہوتو اپنے اہل وعیال پر، اگر اہل وعیال سے فاضل ہوتو اپنے رشتہ داروں پر اور اگر اپنے رشتہ داروں سے فاضل ہوتو فلاں فلاں مصارف پر خرچ کرو'' (صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب الابتداء فی النفقۃ بالنفس، حدیث نمبر: (۹۹۷)، بہ روایت حضرت جابر بن عبداللہ، سنن النسائی، کتاب الزکاۃ، باب أی الصدقۃ أفضل، حدیث نمبر: (۲۵۴۶)، بہ روایت حضرت جابر)۔

اسی طرح اسلام نے انسان کی خود اپنی ضروریات کے درمیان بھی درجہ بندی کرتے ہوئے سب سے پہلا مقام ضرورت کو دیا ہے پھر حاجت کو اور اس کے بعد تحسین کو۔

سوم: سماجی نظام کفالت:

ہر انسانی معاشرہ میں نابالغ بچے ہوتے ہیں جو خود کما نہیں سکتے، کچھ بزرگ ہوتے ہیں جو محنت کے قابل نہیں ہوتے، کچھ بیمار اور معذور ہوتے ہیں جن کی آمدنی ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ناکافی ہوتی ہے بلکہ مزدوری کی کم سے کم حد کام کرنے والے بعض نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے ذمہ کچھ دوسرے اخراجات پر بھی ہوتے ہیں جو ان کی مزدوری سے پورے نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ زمانۂ قدیم سے ان ضروریات کی تکمیل اجتماعی سماجی نظام کے ذریعہ کرتے رہے ہیں۔ شریعت میں اس شعبہ سے متعلق مکمل احکام موجود ہیں:

لوگوں پر ایک دوسرے سے متعلق فرض احکام:

اقرباء کے ذمہ واجب اخراجات، نصاب سے زائد سرمایہ پر عائد فرض زکاۃ، عید کے روز اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات سے زائد مال کے ہر مسلمان مالک پر فرض صدقۂ فطر، مالی کفارے اور قتل خطا کی دیت میں کنبہ کی شرکت اس کی مثالیں یہں۔

حکومت کے خصوصی ذرائع آمدنی سے متعلق احکام:

فے، مال غنیمت کا پانچواں حصہ، زمین کا خراج اور بقیہ تمام قسم کے ٹیکس جن کو فقہاء ''عطاء'' قرار دیتے ہیں، اس کی مثالیں ہیں۔ ''اللہ کے رسولؐ کے پاس جب فے کا مال آتا تھا تو آپ اسے اسی روز تقسیم فرما دیتے تھے۔ آپؐ اس میں سے صاحب عیال شخص کو دو حصے اور غیر شادی شدہ شخص کو ایک حصہ عطا فرماتے تھے'' (سنن ابی داؤد، کتاب الخراج، باب فی قسم الفئ، حدیث نمبر: (۲۹۵۳)، بہ روایت عوف بن مالک۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ مسند احمد کتاب باقی مسند الانصار، باب حدیث عوف بن مالک، حدیث نمبر: (۲۲۸۷۸)۔

اگر حکومت کے ذرائع آمدنی ان ضروریات کی تکمیل کے لئے ناکافی ہوں تو اہل تحقیق فقہاء فرماتے ہیں کہ امام مالداروں کو اپنے فاضل مال کا اتنا حصہ خرچ کرنے کا پابند کرے گا جو ان ضروریات کے لئے ''کافی'' ہو اور سماج میں محتاجی باقی نہ رہے۔ یہاں ''کافی'' میں امام جوینی کے بقول غذا، گوشت، دواء، پھل، لباس اور رہائش شامل ہیں''۔ (الغیاثی للجوینی، بتحقیق الدکتور عبدالعظیم الدیب صفحات: ۲۴۹، ۲۶۷، ۵۱۱)۔

ان ضروریات کی تکمیل کے بعض ذرائع اختیاری بھی ہیں اور اسلام نے لوگوں کے درمیان سرمایے کی تقسیم میں ہونے والی خرابیوں کے ازالہ کے لئے ان کے استعمال پر زور بھی دیا ہے۔

ان ذرائع میں صدقات نافلہ، صدقات جاریہ (رفاہی اوقاف، وقف علی الأولاد)، وصیتیں، ہبہ، ہدایا، عطایا اور قرض حسن شامل ہیں۔

اسلام اور سزائیں:

اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ اسلامی شریعت ایک ایسی ہمہ گیر شریعت ہے جو ایک انسان اور اس کے رب، ایک انسان اور اس کی اپنی ذات، ایک انسان اور اس کے خاندان، ایک انسان اور اس کے سماج، ایک انسان اور اس کی عظیم قوم، ایک انسان اور پوری انسانیت بلکہ ایک انسان اور اس کے اردگرد کی پوری کائنات کے باہمی تعلقات کے اصول وضوابط کو منظّم کرنے ہی کے لئے نازل کی گئی ہے۔

اسی لئے اس کا دائرہ عبادات اور ان سے متعلق نذر، قسم، قربانی، ذبیحہ، نکاح اور عائلی زندگی سے متعلق احکام، خرید وفروخت، مالی معاملات، سیاست شرعیہ، حکومت سے متعلق مسائل، فقہ دستوری کے ذیل میں آنے والے عوام کے حکمراں پر اور حکمراں کے عوام پر حقوق، اسی طرح حالت امن وجنگ میں امت مسلمہ کے دیگر اقوام سے روابط کی تنظیم کرنے والے شعبۂ بین الاقوامی تعلقات نیز حدود وقصاص سمیت فقہ تعزیری کے تحت آنے والے جرائم اور ان سے تحفظ سے متعلق امور تک وسیع ہے۔

فقہ تعزیری وسیع الأطراف شریعت کا محض ایک جزء ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ جب مسلم معاشرہ میں اسلامی شریعت کے نفاذ کی ضرورت کی صابلند کی جاتی ہے تو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے راسخ یہ خیال تازہ ہوجاتا ہے کہ حدود وتعزیرات کی تنفیذ کا مقصود محض چور کا ہاتھ کاٹنا، زناکار کو کوڑے مارنا یا اس کو سنگسار کرنا اور شرابی کو کوڑے مرانا وغیرہ ہے۔

یہ اس حقیقت کے باوجود ہے کہ ان میں سے بیش تر سزائیں مدنی دور کے صرف آخری مرحلہ ہی میں مشروع ہوئیں جب شریعت مکمل اور مستحکم ہوچکی تھی، مثال کے طور پر چوری کی حد: "**والسارق والسارقة فاقطعوا أيديهما**" (المائدہ:۵/۳۸)۔

اسی طرح ڈکیتی کی حد: "**إنما جزاء الذين يحاربون الله و رسوله ويسعون في الأرض فساداً أن يقتلوا أو يصلبوا**" (المائدہ:۵/۳۳)۔ (جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرنے کے لئے دوڑتے ہیں ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں)۔

درست طریقہ پر شریعت اسلامی کی تنفیذ کے لئے مناسب فضا کی تشکیل اور تیاری ضروری ہے اور اس کا واحد راستہ یہی ہے کہ پوری کی پوری شریعت کی حکم رانی ہو۔ اس لئے ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ بے روزگاری اور فقر وفاقہ سے دوچار ہوں، سرمایے کی ناجائز تقسیم کا خمیازہ بھگت رہے ہوں اور سماجی انصاف سے محروم ہوں چوری کی حد جاری کرنا جائز نہیں۔ یعنی ایک ایسے معاشرہ میں چوری کی حد نافذ کرنا ناجائز ہے جو زکاۃ ادا نہ کرتا ہو، بے روزگار کو روزگار، بھوکے کو کھانا، ننگے کو کپڑا اور بے گھر کو گھر فراہم نہ کرتا ہو اور ناخواندہ کے لئے تعلیم کا انتظام نہ کرتا ہو۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے قحط سالی کے زمانہ میں چوری کی حد موقوف کردی تھی، کیونکہ حدود شبہات کی بنا پر رد کردی جاتی ہیں اور بھوک مری کی صورت حال میں اس امر کا قوی شبہ موجود ہے کہ لوگوں نے ضرورت سے مجبور ہوکر ہی چوری کی ہوگی۔ لہٰذا میں اتنی بات حد کی تنفیذ کو روکنے کے لئے کافی تھی تاکہ عوام کے مسائل کا حل نکل سکے۔

اسلام کی نظر میں صرف سزا ہی جرائم کی روک تھام میں بڑا عامل اور محرک نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس جرائم کے وسائل وذرائع کے لوگ ان کے ارتکاب سے بچیں سب سے بڑا عامل اور محرک ہے، کیونکہ پرہیز ہمیشہ علاج سے بہتر ہوتا ہے۔

چنانچہ اگر ہم مثال کے طور پر جرم زنا پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن کریم میں زنا کی حد سے متعلق صرف ایک آیت ہے جو سورۂ نور کی ابتدا میں اس طرح مذکور ہے: "**الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة ولا ت. خذكم بهما رأفة في دين الله إن كنتم تؤمنون بالله واليوم الآخر**" (النور:۲۴ج۲)۔ (زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور تم کو

ان دونوں پر اللہ کے دین کے معاملہ میں رحم نہ آنا چاہئے اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو)۔

جب کہ پوری سورت میں دسیوں دوسری ایسی آیات موجود ہیں جو اس جرم کے ارتکاب سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جرم زنا کی حد شرعی شرائط کی موجودگی میں صرف اسی صورت میں نافذ کی جاسکتی ہے جب فقہاء کی ایک تعداد کے بہ قول، مجرم مجلس عدالت میں چار بار اپنے جرم کا اقرار کرے یا چار عادل گواہ اس بات کی شہادت دیں کہ انہوں نے براہِ راست جرم ہوتے دیکھا ہے۔ ایسا ہو جائے یہ بہت مشکل ہے۔ عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی جرم زنا گواہوں کی گواہی سے ثابت نہیں ہوا۔ لہٰذا اس سلسلے میں مقصود شرع یہ نظر آتا ہے کہ علانیہ جرم سے باز رہا جائے۔ جہاں تک چوری چھپے کسی کا اس میں مبتلا ہو جانا ہے تو یہ شریعت کی دنیوی سزا کے دائرہ میں نہیں آتا اور ایسے شخص کا معاملہ آخرت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

اسی طرح اگر ہم دوسرے جرم یعنی چوری پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم نے سورۂ مائدہ کی صرف دو آیتوں میں اس پر گفتگو کی ہے: "**والسارق والسارقة فاقطعوا أيديهما جزاء بما كسبا نكالا من الله والله عزيز حكيم فمن تاب من بعد ظلمه وأصلح فإن الله يتوب عليه إن الله غفور رحيم**" (المائدہ: ۵/۳۸-۳۹)۔ (اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کے کئے کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا اور اللہ غالب اور حکیم ہے، پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو اللہ بے شک اس پر توجہ کرے گا۔ اور بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے)۔

دوسری طرف مکی و مدنی سورتوں سمیت پورا قرآن ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جو عدل کے قیام، ظلم سے مقابلہ، سماج میں اجتماعی نظام کفالت کے احیاء، مسکین کو کھلانے پر ابھارنے، زکاۃ ادا کرنے اور سماجی طور پر کمزور طبقات مثلاً یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر فے وغیرہ مدات کی آمدنیاں تقسیم کرنے کی تلقین کرتی ہیں تاکہ دولت صرف مال داروں ہی کے درمیان مرتکز ہو کر نہ رہ جائے۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ توبہ کے نتیجہ میں مجرم سے حد ساقط ہو جاتی ہے جیسا کہ شافعیہ اور حنابلہ کا راجح ترین قول ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**فمن تاب من بعد ظلمه وأصلح فإن الله يتوب عليه إن الله غفور رحيم**" (المائدہ: ۵/۳۹)۔ (پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو اللہ بے شک اس پر توجہ کرے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا، مہربان ہے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ توبہ کرنے والے پر حد جاری نہیں کی جائے گی البتہ چوری کیا ہوا مال اس کے مالک کو لوٹایا جائے گا اور قاضی کا یہ حق برقرار رہے گا کہ وہ مجرم پر کوئی مناسب تعزیری سزا نافذ کرے۔

اسی طرح ہمیں چاہئے کہ شدت سے ان لوگوں کی مخالفت کریں جو علی الاطلاق حدود اور تمام جسمانی سزاؤں کے کالعدم قرار دیئے جانے کا مطالبہ محض اس لئے کر رہے ہیں کہ مغرب کی خوشنودی حاصل کر سکیں۔ وہ مغرب جہاں منکر نے معروف اور حرام نے حلال کی صورت اختیار کر لی ہے۔ وہ مغرب جو تمام نبوتوں کے نور ہدایت کا باغی ہو چکا ہے یہاں تک کہ اس نے ہم جنسی کی شادی (مردوں سے مردوں کی اور عورتوں سے عورتوں کی شادی) کو بھی جائز قرار دے رکھا ہے اور "تم شرم وحیاء سے عاری ہو جانے کے بعد جو چاہو کرو" کا مکمل مصداق بن چکا ہے۔

اسلام اور حکومت:

اسلامی حکومت قرون وسطی کے مغربی تصور کے مطابق کوئی مذہبی (Theoratic) حکومت نہیں ہے بلکہ وہ ایک شہری (Civil)

حکومت ہے جس کا مرجع و ماخذ اسلام ہے۔

اسلامی حکومت بنیادی طور پر امت کے آزادانہ انتخاب کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے۔ اس مسئلہ پر بشمول شیعہ امامیہ تمام مسلم مکاتب فکر کا اتفاق ہے اگرچہ شعیہ امامیہ اسے عہد غیبت کے ساتھ خاص مانتے ہیں جب کہ دیگر تمام مسالک کا موقف یہ ہے کہ صرف امت ہی کے ذریعہ اپنے حکمران کا انتخاب تمام قسم کے احوال و ظروف میں ایک اصولی مسئلہ ہے۔ ان کی دلیل چاروں خلفائے راشدین کے انتخاب میں صحابہ کرام کا عمل ہے۔

اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد اللہ کی شریعت کا نفاذ اور اس کے بندوں کے درمیان عدل کا قیام ہے: "**و أن الحكم بينهم بما أنزل الله**" (المائدہ: ۴۹/۵)۔ (اور ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے۔

"**إن الله يأمر بالعدل و الإحسان و إيتاء ذى القربى**" (النحل: ۹۰/۱۶)۔ (بے شک اللہ حکم دیتا ہے عدل کا اور احسان کا اور قرابت داروں کو دینے کا)۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کے درمیان عدل کے قیام کو تمام پیغمبروں کا مقصود قرار دیتا ہے: "**لقد أرسلنا رسلنا بالبينات و أنزلنا معهم الكتاب و الميزان ليقوم الناس بالقسط**" (الحدید: ۲۵/۵۷)۔ (ہم نے اپنے رسولوں کے نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اتاری کتاب اور ترازو تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں)۔

اسلامی حکومت کا مرجع خود اس کا اپنا وضع کردہ نہیں ہے اور نہ وہ اس میں کسی تبدیلی کا اختیار رکھتی ہے۔ یہ مرجع کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہیں۔ اسلامی حکومت کا ستون محض چند "افراد مذہب" نہیں بلکہ درج ذیل صفات کا حامل ہر طاقتور، ایمان دار، حفاظت کرنے والا اور علم رکھنے والا شخص ہے: "**الذين إن مكناهم فى الأرض أقاموا الصلاة و آتوا الزكاة وأمروا بالمعروف و نهوا عن المنكر ولله عاقبة الأمور**" (الحج: ۴۱/۲۲)۔ (یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں غلبہ دیں تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے اور زکاۃ ادا کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے)۔

اسلامی حکومت امت کی زیر نگرانی اور اس کے احتساب کے تحت اپنے فرائض انجام دیتی ہے۔ حکمراں عوام کی نظر میں ایک خادم ہے۔ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کی خیر خواہی کریں، اس کا احتساب کریں اور معروف میں اس کی اطاعت کریں۔ اگر کوئی حکمراں معصیت کا حکم دے تو نہ اس کی بات سنی جائے گی اور نہ اس پر عمل کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص راہ ہدایت سے منحرف حکمراں کا ناجائز حکم تسلیم کرنے سے انکار کے نتیجہ میں قتل کا نشانہ بن جائے تو وہ شہید ہوگا: "شہداء کے سردار حمزہ ہیں اور وہ شخص بھی جو کسی ظالم حکمراں کے روبہ رو کھڑا ہوا اور اس کا ناجائز حکم ماننے کے نتیجہ میں قتل کر دیا جائے" (۱)

اسلامی حکومت اپنے فرائض شوری کے ذریعہ انجام دیتی ہے: "**و أمرهم شورى بينهم**" (الشوری: ۳۸/۴۲)۔ (اور وہ اپنا کام مشورے سے کرتے ہیں)۔ "**و شاورهم فى الأمر**" (آل عمران: ۱۵۹/۳)۔ (اور معاملات میں ان سے مشورہ لو)۔

یہ بات درست نہیں ہے کہ امیر مشورہ کرے پھر اپنی مرضی سے جو فیصلہ چاہے کر لے۔ شوری کبھی امیر کے خصوصی اختیارات اور اس کے دائرہ کار میں اس کی رہنمائی کی اور اگر مشورہ کا تعلق ان امور سے ہو تو دیگر متعلقہ مجالس اور شعبوں کے اختیارات اور ان کے دائرۂ کار کے تحت آتے ہوں تو اس کی تعمیل امیر پر لازم ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہو تو شوری کی تشکیل کا کوئی فائدہ نہیں اور اہل شوری کا اہل حل وعقد کا نام دینے کی کوئی افادیت نہیں۔

اختیارات کی تقسیم:

انسانیت طویل اور تلخ تجربات سے گزر کر اس نتیجہ تک پہنچی ہے کہ اختیارات کو جو کبھی ایک حاکم مطلق کی ذات میں مرتکز ہوا کرتے تھے، تین شعبوں: مقنّنہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں منقسم ہونا چاہئے۔ تقسیم اختیارات کا یہ تجربہ حکمرانوں کے ظلم وستم کو کم کرنے یا آخر کار اسے ختم کرنے، سماج کے سرکش عناصر کے جبر وتسلط کے مقابلہ میں حقوق انسانی کے تحفظ، سیاسی آزادیوں کے فروغ، غیر حکومتی پریس اور آزاد ذرائع ابلاغ کے وجود، حزب اختلاف کی تشکیل اور آزادانہ انتخابات کے انعقاد کی صورت میں کامیاب رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں عوام اختیارات کے مابین فاصلہ کو منظّم کرنے والے تحریری دساتیر کے ذریعہ اقتدار کی مشینری اور اس کے دائرہ کار کے تعین سے آشنا ہوئے۔ اسی طرح اس تجربہ نے سیاسی عمل کی آزادی کو بھی منظّم کیا ہے۔ یہ وہ فائدے ہیں جو عوام کی اصطلاح کے مطابق ''جمہوریت'' سے حاصل ہوئے ہیں۔ جمہوریت کا تصور اسلام کی روح، اس کے سیاسی مقاصد اور اس کے عمومی مبادیات سے ہم آہنگ ہے اگرچہ اس کے متعلق براہ راست جزئی نصوص وارد نہیں ہیں۔

جمہوریت:

جمہوریت کی علی الاطلاق نفی اس دلیل کی بنا پر کہ یہ ایک درآمد شدہ تصور ہے، اس وقت تک غلط قرار دی جاتی رہے گی جب تک کہ اس کے عناصر اسلام کے بیش تر احکام، اس کے اصول ومبادی اور اس کی اقدار کے تطبیقی وسائل کی تشکیل کا کام انجام دیتے رہیں گے یا کم سے کم سے اسلام سے متصادم نہ ہوں گے۔ یہ موقف کہ جمہوریت کا مطلب عوام کی حکمرانی ہے جب کہ اسلام کا مقصود اللہ کی حکمرانی ہے، ان دونوں تصورات کے درمیان مکمل تضاد کے مفروضہ پر مبنی ہے جو درست نہیں۔ کیونکہ یہ عین ممک ہے کہ عوام جمہوری ذرائع سے اللہ کی حکومت کا انتخاب کرلیں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ عوام کی مرضی اور ان کے فیصلہ سے اللہ کی حکومت وجود میں آجائے۔ یہ صورت اقتدار ظالم وجابر حکم رانوں کے انتخاب سے بدرجہا بہتر ہوگی۔ قرآن کریم عوام کے اپنے اختیار سے تشکیل دی گئی حکومت کو درست قرار دیتا ہے جب کہ وہ فراعنہ اور طواغیت کے اقتدار درست نہیں ٹھہراتے۔ قرآن فرعون، ہامان اور قارون کی مذمت کرتا ہے اور زمین میں ناحق اپنی بڑائی کا اظہار کرنے والے جابر حکام کو ملعون قرار دیتا ہے:"إن فرعون و هامان و جنودهما كانوا خاطئين" (القصص:۸/۲۸)۔ (بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطا کار تھے)۔

یہ نقطۂ نظر کہ اکثریت کی رائے پر عمل کرنا ایک درآمد شدہ اور اسلامی تعلیمات سے متصادم تصور ہے، مسترد کئے جانے کے قابل ہے۔ اکثریت کی رائے پر عمل کا مستند ہونا دلائل سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں اس پر عمل فرمایا تھا۔ حضرت عمر نے بھی اس پر عمل کرتے ہوئے ان چھ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جن کو یہ اختیار دیا تھا کہ کثرت رائے کی بنا پر اپنے میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کرلیں گے اور صحابہ نے اس پر عمل بھی کیا۔ (سنن ابن ماجہ، کتاب الغنی، باب السواد الأعظم بہ روایت حضرت انس بن مالک۔ اس روایت کی سند میں ضعف ہے۔ اس کی روایت امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت نعمان بن بشیر سے کی ہے۔ اس روایت کا پہلا جز صحیح ہے)۔

رسول اللہؐ نے سواد اعظم یعنی اکثریت کے اتباع کا حکم دیا ہے۔

سیاسی آزادیاں:

اسلام انسان کی آزادی اوراس کے بنیادی حقوق کا اس درجہ احترام کرتا ہے کہ وہ مذہب کے سلسلہ میں بھی جبر کوممنوع قرار دیتا ہے:
"لا إکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" (البقرہ:۲/۲۵۶)۔(دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہوچکی ہے)۔

اسلام انسان کی سیاسی آزادی کا احترام کرتے ہوئے اسے یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ جسے چاہے اپنا رہنما منتخب کرے اور جس عہدہ کا بھی چاہے امیدوار بنے بشرطیکہ اس میں مطلوبہ شرائط پائے جائیں۔اسلام نے انسان کو یہ حق دیا ہے کہ اگر وہ اپنے حکمراں کو غلط کرتے ہوئے دیکھے تو اس پر تنقید کرے بلکہ رعایا کی طرف سے حکمراں کی خیر خواہی ایک شرعی فریضہ ہے اگر چہ اس کے نتیجہ میں خیر خواہی کرنے والے کو ضرر سے دوچار ہونا پڑے۔خلفائے راشدین نے مخالفانہ سیاسی رائے کی موجودگی کو تسلیم کیا ہے خواہ وہ کسی فرد کی طرف سے ہو یا کسی جماعت کی طرف سے۔اسی طرح انھوں نے مخالفانہ رائے رکھنے والوں کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ وہ شرعی اصول وضوابط کے دائرہ میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرسکتے ہیں اور اس کے دفاع وتعاون کے لئے اقدامات کرسکتے ہیں۔اس کی ایک مثال حضرت علیؓ کا خوارج کو تسلیم کرنا، نہ کہ ان کے افکار وخیالات کو، اور ان کے حقوق کو اس وقت تک تحفظ عطا کرنا ہے جب تک کہ وہ مسلمانوں سے جنگ میں پہل نہ کریں۔

موجودہ دور کے بیش تر معاشروں میں سیاسی آزادیوں اور ایک پارٹی کے نظام کے بجائے متعدد پارٹیوں کی تشکیل کے ذریعہ سیاسی تکثریت کو تسلیم کرنے پر زور دیا گیا ہے اسلام میں ایک سے زائد پارٹیوں کی ممانعت نہیں ہے بہ طور خاص اس صورت حال میں جب کہ یہ تکثریت تضاد اور تناقض کے بجائے تنوع اور اختصاص پر اور باہمی بغض وہ منافرت کے بجائے تعاون وتناصر پر مبنی ہو۔اسلام سیاسی پارٹیوں کے تنوع کا اس وقت تک مخالف نہیں ہے جب تک کہ یہ تمام سیاسی پارٹیاں امت کے مسلمات کا احترام کرتی رہیں اور اس کے دشمنوں کے ساتھ تعاون نہ کرڈیں۔یہ موقف میثاق مدینہ سے اچھی طرح واضح ہے جو تمام بنیادی سیاسی اجزاء کے باہمی ربط کو منظّم کرتا ہے۔آج کے دور میں یہ پارٹیوں کے نظام سے زیادہ مشابہ ہے۔مہاجرین مکہ کی ایک پارٹی تھی، انصار بشمول اوس وخزرج اہل مدینہ کی پارٹی تھی اور یہود اپنے مختلف قبائل سمیت ایک پارٹی تھے۔حقیقت یہ ہے کہ جماعتی اور سیاسی تکثیریت ہی شریعت کے مقاصد اور اس کے عمومی مبادیات کی ترجمانی کرتی ہے۔

ہم جمہوریت کے ساتھ زندگی سے متعلق مغرب کے مادہ پرستانہ تصور کو قبول نہیں کرڈیں گے، کیونکہ ہمارے پاس ہمارا اپنا فلسفۂ حیات موجود ہے جو ہمارے عقیدہ سے مستفاد ہے، ہمارے پاس اپنی دینی اور اخلاقی اقدار موجود ہیں جو قرآن کریم اور سنت مطہرہ کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔اس کے برعکس ہم جمہوریت کو اس کی مشینری اور اس کے ان تحفظات کے ساتھ لیں گے جن کے ذریعہ ظالم اور جابر حکمرانوں کے پر کترے جاسکیں۔جمہوریت دراصل طویل انسانی تجربات کا نچوڑ ہے جس سے مسلمان کبھی دور نہیں رہے۔مسلمانوں کا حق ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں تا کہ ہماری اسلامی تاریخ کے بہت سے روشن پہلوؤں کو مسخ کرنے والے بار بار کے سیاسی جور واستبداد کا راستہ روکا جاسکے۔

اسلام، امن اور جہاد:

اللہ کے رسولؐ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ اللہ کی طرف بلاتے رہے۔آپ ان سے کسی معاوضہ کے طالب نہ تھے اور نہ آپ ان سے کسی اور چیز کے خواہاں تھے۔آپ کے پیش نظر صرف یہ مقصد تھا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے دل سے قائل ومعترف ہوجائیں۔

مگر آپؐ کے قبیلہ قریش اوران کے اردگرد کے مشرکین عرب نے آپ کی دعوت کے مقابلے میں ایذا رسانی، ظلم، فتنہ، بائیکاٹ اور تشدد کا طریقہ اختیار کیا اور یہ سلسلہ بالآخر وطن سے جبری ہجرت پر جا کر رکا۔

مسلمان رسول اللہؐ کے پاس زخمی اور مجروح حالت میں آتے تھے اور آپؐ سے اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت طلب کرتے تھے مگر آپؐ انہیں صبر اور تکلیف برداشت کرنے کا حکم دیتے تھے اور فرماتے تھے: "فوا أيديكم و أقيموا الصلاة" (النساء: ۴/۷۷)، (اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو)۔

مسلمان پورے مکی دور میں مسلسل جہاد کرتے رہے مگر یہ جہاد تلواروں اور نیزوں کے ذریعہ نہیں تھا۔ یہ جہاد دعوت اور پیغام رسالت کی توضیح وتبلیغ کے ذریعہ تھا جسے قرآن نے اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشاد میں "جہاد کبیر" (بڑا جہاد) قرار دیا ھے: "فلا تطع الكافرين و جاهدهم به جهاداً كبيرا" (الفرقان: ۲۵/۵۲)۔ (لہٰذا تم منکروں کی بات نہ مانو اور اس کے ذریع سے ان کے ساتھ بڑا جہاد کرو)۔

یہ جہاد آزمائش اور ایذا رسانی پر صبر کے ذریعہ تھا۔ اسی کا ایک حصہ وہ مقاطعہ (بائیکاٹ) ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو درختوں کے پتے چبانے پڑے۔ اسی طرح حبشہ کی طرف دوبار کی ہجرت بھی اسی جہاد کا ایک جز ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أحسب الناس أن يقولوا آمنا وهم لايفتنون" (العنکبوت: ۲۹/۲)۔ (کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ محض یہ کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو جانچا نہ جائے گا)۔

مسلمان ہمیشہ اپنی پوری زندگی میں جہاد ہی کرتا رہتا ہے: وہ اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے وہ اپنے اوپر مسلط شیطان سے جہاد کرتا ہے۔ وہ اپنے گرد وپیش جاری شر وفساد سے جہاد کرتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی تبلیغ میں اپنی زبان اور اپنے قلم سے جہاد کرتا ہے مگر وہ ہمیشہ قتال (جنگ) نہیں کر رہا ہوتا ہے۔

قتال ہر حال میں واجب نہیں ہے بلکہ اس کے واجب ہونے کے لئے کچھ اسباب کا پایا جانا ضروری ہے جن کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ آپؐ کے صحابہ نے پورے مکی عہد میں جہاد کرتے زندگی گزاری مگر آپؐ اور آپؐ کے صحابہ نے قتال صرف ہجرت کے بعد کیا۔

مسلمان ہجرت مدینہ تک اسی موقف پر قائم رہے۔ ہجرت کے بعد وہ سب سے پہلی آیت نازل ہوئی جس میں مسلمانوں کو اپنی جان اور اپنی عزت وآبرو کے دفاع کے لئے قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ وہ آیت یہ ہے: "أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا إلا أن يقولوا ربنا الله" (الحج: ۲۲/۴۰)۔ (اجازت دی گئی ان لوگوں جو جس سے لڑائی کی جا رہی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ وہ لوگ جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے صرف اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے)۔

رسول کریمؐ مدنی دور میں پورے سال تک ان محاذوں پر جنگ کرتے رہے جو دعوت اسلامی کے علانیہ دشمن تھے یعنی عرب بت پرستی کا محاذ، یہودی محاذ اور روم کی بازنطینی سلطنت کا محاذ۔ اسی صورت حال نے آپ کو ستائیس جنگوں میں بہ ذات خود شریک ہونے اور پچاس سے زائد معرکوں میں اپنے صحابہ کو بھیجنے پر مجبور کیا۔ آپ ان میں سے کسی بھی کاروائی میں جنگ کے لئے پہل کرنے والے نہ تھے اور نہ آپؐ ان میں سے کسی جنگ میں دوسروں پر ظلم کرنے والے تھے۔ ان تمام جنگوں میں آپؐ کی طرف سے کی جانے والی کاروائی کی نوعیت کسی پیش آمدہ یا متوقع جنگ کے حوالے سے ایک ردّعمل کی تھی۔ اس کی شہادت بدر سے تبوک تک کے تمام غزوات رسول کی تاریخ کا ایک انصاف پسند طالب

علم دے سکتا ہے بلکہ مخالفین اسلام کے بعض حملے تو براہ راست مسلمانوں پر ان کے گھر میں گھس کر کئے گئے جیسا کئے گئے جیسا کہ غزوۂ احد اور غزوۂ خندق میں ہوا۔ اسی لئے امت کے اہل تحقیق علماء کی رائے ہے کہ جہاد صرف جان کی حرمت اور غزت وآبرو کے دفاع کے لئے مشروع کیا گیا ہے۔ تمام قرآنی آیات اور صحیح احادیث اس موقف کی واضح دلیلیں ہیں۔

ہمارے لئے مشرکین کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: ''**فإن اعتذلوكم فلم يقاتلوكم و ألقوا إليكم السلم فما جعل الله لكم عليهم سبيلا**'' (النساء: ۴/ ۹۰)۔ (لہٰذا اگر وہ تم کو چھوڑے رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں اور تمہارے ساتھ صلح کا رویہ رکھیں تو اللہ تم کو بھی ان کے خلاف کسی اقدام کی اجازت نہیں دیتا)۔

یہ آیت مشرکین سے قتال کے حرام ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس صورت حال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''**فإن لم يعتزلوكم و يلقوا إليكم السلم ويكفوا أيديهم فخذوهم واقتلوهم حيث ثقفتموهم و أولئكم جعلنالكم عليهم سلطاناً مبينا**'' (النساء: ۴/ ۹۱)۔ (لہٰذا اگر وہ تم سے یکسو نہ رہیں اور تمہارے ساتھ صلح کا رویہ نہ رکھیں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم ان کو پکڑو اور ان کو قتل کرو جہاں کہیں پاؤ۔ یہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو کھلی حجت دی ہے)۔

یہ اور ان جیسی دوسری آیات کے بارے میں جو یہ خیال ظہار کیا گیا ہے کہ یہ سب کی سب اس خیال کے حاملین کے بقول ''آیت سیف'' سے منسوخ ہیں تو یہ قابل رد ہے، کیونکہ یہ کوئی معقول اور جائز بات نہیں کہ ہم ان آیات کی منسوخی پر گفتگو کرنے والے چند علماء کی آراء کی بنیاد پر یقینی تواتر سے ثابت شدہ اللہ تعالیٰ کے قطعی کلام کو معطل اور بے مصرف قرار دے لیں۔

علاوہ ازیں اس خیال کے حاملین ''آیت سیف'' پر کہ وہ کون سی آیت ہے، باہم متفق نہیں۔ زیادہ تر لوگوں نے کہا ہے کہ آیت سیف'' سے مراد یہ آیت ہے: ''**فإذا انسلخ الأشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث و جدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوهم كل مرصد**'' (التوبۃ: ۹/ ۵)، (پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی گھات میں)۔

یہاں مشرکین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر سورت کے شروع میں آیا ہے:

''**برائة من الله و رسوله إلى الذين عاهدتم من المشركين**'' (التوبۃ: ۹/ ۱)۔ (اعلان برائت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے)۔

اس سے مراد عام مشرکین نہیں ہیں بلکہ یہاں وہ اہل شرک مراد ہیں جن سے اللہ اور اس کے رسول اعلان برائت کر چکے ہیں، کیونکہ انہوں نے عہد کرنے کے بعد اس کو توڑا، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان کے حق میں یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا کہ پورے مکی اور مدنی ادوار میں اسلام، پیغمبر اور اسلامی دعوت کے حوالے سے ان اہل شرک کا رویہ غلط رہا۔

اسلام اور امن:

سچی بات یہ ہے کہ اسلام جنگ وجدال اور خوں ریزی کا ہرگز شائق وخواہاں نہیں، بلکہ اگر مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان جاری تنازعہ بغیر خوں ریزی اور جنگ کے ختم ہوجاتا ہے تو قرآن اس صورت حال کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: ''**ورد الله الذين كفروا بغيظهم لم ينالوا خيراً وكفى الله المؤمنين القتال و كان الله قويا عزيزاً**'' (الأحزاب: ۳۳/ ۲۵)۔ (اور اللہ نے منکروں کو

ان کے غصہ کے ساتھ پھیر دیا کہ ان کی کچھ بھی مراد پوری نہ ہوئی اور مومنین کی طرف سے لڑنے کے لئے اللہ کافی ہوگیا اللہ قوت والا زبردست ہے۔

یہ جملہ کتنا بلیغ ہے اور اسلام کی صاف ستھری روح کی کتنی سچی ترجمانی کرتا ہے: "**وکفی الله المؤمنین القتال**" (اور مومنین کی طرف سے لڑنے کے لئے اللہ کافی ہوگیا)۔

جب غزوۂ حدیبیہ قریش کے ساتھ صلح پر انجام پذیر ہوا اور فریقین کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا تو اس سلسلے میں سورۂ فتح نازل ہوئی: "**إنا فتحنا لک فتحاً مبینا**" (الفتح: ۴۸/۱)۔ (ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح دے دی)۔

اس موقع پر بعض صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے سول! کیا یہ فتح ہے؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں یہ فتح ہے" (اس حدیث کی روایت ابوداؤد نے کتاب الجہاد حدیث نمبر: (۲۷۳۶) میں مجمع بن جاریہ سے، طبرانی نے الکبیر (۹۱/ ۵۴۴) میں اور حاکم نے مستدرک میں، کتاب قسم النبی (۲/۱۴۱ ۳) میں کی ہے۔ حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث طویل اور صحیح الاسناد ہے، اگرچہ شیخین نے اس کی روایت نہیں کی ہے)۔

یہ سوال ان کی طرف سے اس وجہ سے کیا گیا کیونکہ وہ جنگ کے بغیر فتح کے تصور سے ناآشنا تھے۔ خود اسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر اپنے احسان کا اظہار یوں فرمایا ہے: "**وهو الذی کف أیدیهم عنکم و أیدیکم عنهم ببطن مکة من بعد أن أظفرکم علیهم**" (الفتح: ۴۸/ ۲۴)۔ (اور وہی ہے ج سنے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو دے دیا تھا)۔

یہاں آپ دیکھئے: کیسے اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ہاتھوں کو ان کے دشمنوں سے روکنے کی صورت حال کو اپنا ایک احسان قرار دیا ہے۔

اللہ کے رسولؐ لوگوں میں سب سے زیادہ بہادر ہونے کے باوجود جنگ کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپؐ اپنے صحابہ سے فرماتے تھے: "دشمن سے مڈبھیڑ کی آرزو نہ کرو اور اللہ سے عافیت سے طلب کرو، اس کے باوجود اگر دشمن سے تمہارا سامنا ہو ہی جائے تو پھر ثابت قدم رہو" (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب کان النبی إذا لم یقاتل أول النہار أخر القتال، حدیث نمبر: (۲۷۴۴) یہ روایت حضرت عبداللہ بن اوفی۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر، باب کراہۃ فی لقاء العدو، حدیث نمبر: (۳۲۷۶) یہ روایت حضرت عبداللہ بن اوفی)۔

آپؐ فرماتے تھے: "اللہ کی نظر میں سب سے پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمان ہیں اور اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند یہ نام ہیں: حرب اور مرۃ (سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب تغییر الأسماء، حدیث نمبر: (۴۹۵۰) یہ روایت ابووہب الجشمی۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الأدب، باب ما یستحب من الأسماء، حدیث نمبر: (۳۷۱۸) یہ روایت حضرت ابن عمر۔ مسند احمد، کتاب مسند المکثرین من الصحابۃ، باب مافی المسند السابق، حدیث نمبر: (۵۸۴۸) یہ روایت ابن عمر۔ اس سند کے راوی ثقہ ہیں)

آپؐ کو جنگ سے اتنی نفرت تھی کہ آپؐ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے دستور کے خلاف لفظ "حرب" (جنگ) سے کسی شخص کا نام رکھنا پسند نہ فرماتے تھے۔ اس طرح کے نام رکھنا عربوں کے ہاں عام رواج تھا جیسے حرب بن امیہ۔

اسی لئے ہمارا ایمان ہے کہ اسلام امن کا داعی ہے اور اس کا خیر مقدم کرتا ہے، یہاں تک لفظ "السلام" (سلامتی) دنیا و آخرت میں مسلمانوں کے لئے ایک استقبالیہ کلمہ شمار کیا جاتا ہے: "**تحیتهم یوم یلقونه سلام**" (الأحزاب: ۳۳/ ۴۴)۔ (جس روز وہ اس سے ملڈں گے، ان کا استقبال سلام سے ہوگا)۔

مسلمانوں کے ہاں اللہ تعالیٰ کے بہترین ناموں میں سے ایک نام ہے: السلام: "**الملک القدوس السلام**" (بادشاہ، سب

عیبوں سے پاک اور سلامتی)(الحشر ۵۹/ ۲۳)۔

عبدالسلام نام مسلمانوں کے ہاں مقبول ہے۔جنت کا ایک نام "دار السلام" ہے:"**لهم دار السلام عند ربهم**" (الأنعام: ۶/ ۱۲۷)۔(انہیں کے لئے سلامتی کا گھر ہے ان کے رب کے پاس)۔

اسلام اور جہاد:

البتہ ایک صورت حال ایسی بھی ہے جس میں اسلام جنگ پر آمادہ کرتا ہے اور اس راستہ میں جان اور قیمتی مال صرف کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔اس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب اسلام کے مقدس اصولوں کی پامالی یا اس کی سرزمین پر حملے یا اس کی شبیہ مسخ کئے جانے کی صورت میں اہل اسلام پر ان کی ناپسندیدگی کے باوجود جنگ فرض ہوجاتی ہے۔یہ فرضیت درج ذیل آیات یک بنا پر ہے:"**ألا تقاتلون قوماً نكثوا أيمانهم و هموا بإخراج الرسول وهم بدؤكم أول مرة أتخشونهم فالله أحق أن تخشوه إن كنتم مؤمنين**" (التوبۃ:۹/ ۱۳)۔(کیا تم نہ لڑوگے ایسے لوگوں سے جنہوں نے اپنے عہد توڑ دیئے اور رسول کو نکالنے کی جسارت کی اور وہی ہیں جنہوں نے تم سے جنگ میں پہل کی۔کیا تم ان سے ڈروگے۔اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو)۔

"**كتب عليكم القتال وهو كره لكم و عسى أن تكرهوا شيئاً وهو خير لكم و عسى أن تحبوا شيئاً وهو شر لكم والله يعلم وأنتم لاتعلمون**" (البقرہ:۲/ ۲۱۶)۔(تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تم کو گراں معلوم ہوتی ہے۔ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لئے بھلی ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے بری ہو اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے)۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام قتال کا داعی ہے،امن سے نفرت دلاتا ہے اور امن کے پیغام کا مخالف ہے۔یہ اسلام کے حوالے سے ایک غلط فہمی ہے۔

جہاد کے چند اسباب:

درج ذیل چند اسباب کے پیش نظر جہاد کا قانون وضع کیا گیا ہے:

فتنہ یعنی دین کے سلسلہ میں جبر کے خاتمہ کے لئے:"**و قاتلوهم حتى لاتكون فتنة و يكون الدين الله**" (البقرۃ: ۲/ ۱۹۳)،(اور تم ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہوجائے)۔

قرآن نے فتنہ کو قتل سے شدید اور قتل سے سنگین جرم قرار دیا ہے،کیونکہ قتل انسان کے مادی وجود پر ایک زیادتی ہے اور فتنہ اس کے روحانی وجود پر ایک حملہ ہے۔فتنہ کے خاتمہ کا مطلب ہے سب کے لئے مذہبی آزادی کا تحفظ۔لہٰذا ایسی صورت حال میں جنگ انسان اور اس کی آزادی کا دفاع ہے۔

جہاد کا ایک محرک ستائے جارہے کمزور لوگوں کو ذلت اور ظلم سے نجات دلانا بھی ہے:"**ومالكم لاتقاتلون في سبيل الله والمستضعفين**" (النساء:۴/ ۵)۔(اور تم کو کیا ہوا کہ تم نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور کمزور مردوں کے لئے)۔

جہاد کی ایک غایت دینی اور وطنی مقدسات کے خلاف ہورہی جارحیت کا مقابلہ بھی ہے:"**وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولاتعتدوا إن الله لايحب المعتدين**" (البقرۃ:۲/ ۱۸۹-۱۹۰)۔(اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں

اور زیادتی نہ کرو اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔

ظلم کے خلاف ظلم ہی کے بہ قدر کی جانے والی جوابی کاروائی کو غلط نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے:"وقاتلوا المشركين كافة كما يقاتلونكم كافة" (التوبۃ:۹/۳٦)،(اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں)۔

ان تمام ہدایات کے باوجود صلح اور مفاہمت کا دروازہ بند نہیں ہے اگر اس کے مواقع اور حالات پیدا ہو جائیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"و إن جنحوا للسلم فاجنح لها و توكل على الله" (الأنفال:۸/٦۱)۔(اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو)۔

صلح کا اہم ترین موقع یہ ہے کہ جارحیت کا سد باب ہو جائے،قابض طاقت مقبوضہ سرزمین سے بے دخل کر دی جائے اور حق داروں کو ان کے حقوق واپس مل جائیں۔

اسلام میں جہاد چند قطعی اور لازمی ''اخلاقی اصولوں'' کے تابع ہے،لہٰذا اسلام میں جنگ کے لئے آمادہ اور اس کے لئے پہل کرنے والے کے سوا کسی کا قتل جائز نہیں، نہ عورتوں کا، نہ بچوں کا، نہ عمر دراز بوڑھوں کا، نہ عبادت گاہوں میں مقیم مذہبی پجاریوں کا، نہ کسانوں اور تاجروں کا،اسلام میں دھوکہ دینا جائز نہیں، نہ لاشوں کا مثلہ کرنا، درختوں کو کاٹنا،عمارتوں کو ڈھانا اور کنوؤں کو زہر آلود کرنا جائز ہے۔اسی طرح اسلام میں ''جلتی زمین کی پالیسی'' نام کی کوئی چیز نہیں ہے جس کے تحت جنگ زمین کی ہر چیز کو کھنڈر میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔اسلام میں جنگ سے متعلق قطعی اصول صحیح نصوص سے ثابت ہیں اور ان کو خلفائے راشدین اور ان کے بعد کے مسلمانوں نے عملاً نافذ کیا ہے۔

اس کی شہادت مسلمانوں کی فتوحات جو دراصل روم و ایران کی قدیم شہنشاہتوں کے طاغوی چنگل سے اقوام کو آزاد کرانے کے لئے کی گئی تھیں، کی تاریخ لکھنے والے اہل مغرب نے بھی دی ہے۔ یہ مؤرخین کہتے ہیں کہ'' تاریخ نے عربوں یعنی مسلمانوں سے زیادہ انصاف پرور اور رحم دل حکمراں نہیں دیکھے''۔

یہ اور بات ہے کہ جنگ بہ طور خاص ہمارے موجودہ دور میں صرف عسکری پہلو تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کی متعدد اقسام ہیں۔ان ہی میں ایک قسم اقتصادی جنگ ہے، ایک قسم ابلاغی جنگ ہے، ایک قسم فکری اور تہذیبی بلکہ دینی اور اعتقادی جنگ ہے۔ان جنگوں میں سے ہر ایک جنگ کے مخصوص ہتھیار اور اس کے متعین مردان کار ہیں۔

آج ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہم پر ہر چہار جانب سے جنگ تھوپی جا رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر ممکن طاقت سے اس کا مقابلہ کریں، اپنی امت کو خطرات سے محفوظ کرنے کے لئے اور اس کے دفاع کے لئے تربیت یافتہ فوجیں تیار کریں ہمارا فریضہ ہے کہ دشمن کا مقابلہ اسی کے جیسے ہتھیاروں سے کریں، کیونکہ ہمارا مقصود اپنے حقوق کا تحفظ و دفاع ہے، بلکہ ہمارا تو ایمان ہے کہ دنیا کی تمام اقوام کو اپنی زمین کو آزاد کرانے، اس پر ہو رہی جارحیت کے خلاف جوابی اقدامات کرنے اور اپنی پسند کا نظام حکومت منتخب کرنے کا پورا پورا حق ہے۔ یہ ایک فطری حق ہے جس کا تعین الٰہی قوانین، بین الاقوامی دساتیر اور حقوق انسانی کے جواز کے ذریعہ ہوا ہے۔اسی لئے ہم مسلمان ممالک اور بہ طور خاص اسراء اور معراج کی سرزمین فلسطین میں غیر ملکی قبضہ کے خلاف جاری مزاحمت کو اللہ کی راہ میں جہاد تصور کرتے ہیں اور تمام مسلمان اقوام اور حکومتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ملکوں کو ہر قسم کے ناجائز قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے بھر پور جدوجہد اور تعاون کریں۔ہم اس تحریک مزاحمت کو دہشت گردی قرار دینے کے سخت مخالف ہیں۔ کیونکہ قبضہ ہی اصلاً دہشت گردی ہے اور تمام دستیاب وسائل و ذرائع سے اس کا مقابلہ کرنا ایک قانونی اور جائز حق ہے بلکہ یہ ایک دینی فریضہ اور ذمہ داری ہے۔ جو اس میں بغیر کسی عذر کے کوتاہی کرے گا وہ گنہ گار ہو گا۔

لیکن ہم اسی کے ساتھ ساتھ حکومتوں اور ان کے عوام کے درمیان فرق بھی کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف ہم تسلسل کے ساتھ ظلم وجارحیت کا مظاہرہ کرنے والی اور قبضہ کو تعاون فراہم کرنے والی حکومتوں کی مذمت کرتے ہیں تو دوسری طرف حقوق انسانی کا احترام کرنے والے مغربی معاشروں کی ان خیر پسند طاقتوں کی کاوشوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی حکومتوں سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ ہمارے مسلمان ممالک پر حملے بند کئے جائیں اور ہم مختلف اقوام کے باہمی تعلقات میں انسانی اقدار کی بالادستی کی خاطر ان سے مربوط ہونے کی اپنی آمادگی اور خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔

اسلام اور دہشت گردی:

۱-ہمارا ایمان ہے کہ اسلام رحمت اور نرمی کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ سے اپنے خطاب میں رحمت کو رسالت محمدی کا عنوان منتخب کیا: "**وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين**" (الأنبياء:۲۱/۱۰۷)، (اور ہم نے تم کو تو بس دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

اسی طرح پیغمبر اسلامؐ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: ''میں ہدیہ میں دی گئی ایک رحمت ہوں'' (الحاکم فی المستدرک، کتاب الایمان، حدیث نمبر: (۱۰۰) بہ روایت حضرت ابوہریرہ۔ حاکم کہتے ہیں: یہ روایت شیخین کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ دارمی، کتاب المقدمۃ، باب کیف شأن النبیؐ حدیث نمبر: (۱۵) بہ روایت ابوصالح۔ اس روایت کے راوی ثقہ ہیں)۔

اسی لئے مسلمانوں کے درمیان اپنے پیغمبر کو ''محمد نبی رحمت'' کے لقب سے یاد کرنا ایک مقبول عام طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی آپؐ کی اس صفت کا ذکر فرمایا ہے: "**فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظاً غليظ القلب لانفضوا من حولك**" (آل عمران: ۳/۱۵۹)، (یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان کے لئے نرم ہو۔ اگر تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے بھاگ جاتے)۔

رحم دلی کی ترغیب دینے والی احادیث نبویہ کثرت سے مروی ہیں: ''رحم دلی سے پیش آنے والوں پر اللہ مہربان ہوتا ہے'' (سنن الترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی رحمۃ الناس، حدیث نمبر: (۱۸۴۷) بہ روایت عبداللہ بن عمرو۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرحمۃ، حدیث نمبر: (۴۲۹۰) بہ روایت عبداللہ بن عمرو)۔

(تم زمین والوں پر مہربانی کرو آسمان والا تم پر مہربانی کرے گا'' (سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الرحمۃ، حدیث نمبر: (۴۲۹۰) بہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو۔ سنن الترمذی، کتاب البر والصلۃ عن رسول اللہ، حدیث نمبر: (۱۸۴۷) باب ماجاء فی الرحمۃ، بہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے)۔

(جو کسی پر رحم نہیں کرتا اس پر کوئی رحم نہیں کرتا'' (صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ، حدیث نمبر: (۵۵۳۸) بہ روایت حضرت ابوہریرہ، صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمۃ الصبیان والعیال، حدیث نمبر: (۴۲۸۲) بہ روایت حضرت ابوہریرہ)۔

احادیث میں ذکر ہے کہ ایک فاحشہ نے شدید پیاس سے دوچار ایک کتے کو پانی پلایا اور اللہ نے اس کی مغفرت فرمادی (صحیح مسلم، باب السلام (۱۵۴)۔

اسی طرح ایک عورت صرف اس وجہ سے جہنم کی مستحق قرار پائی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ کر رکھا اور وہ بلی اسی حالت میں مرگئی (صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم قتل الہرۃ، حدیث نمبر: (۴۱۶)۔

یہ اسلام میں ہمدردی کی اہمیت کے واضح ثبوت ہیں یہاں تک کہ جانوروں کے بارے میں اس کی ہمدردانہ تعلیمات کس قدر انوکھی ہیں جانوروں کے ساتھ کئے گئے ہمدردانہ سلوک بھی گناہوں کا خواہ وہ کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، کفارہ بن جاتے ہیں اگرچہ ان نیکیوں کی وجہ

سے گناہ کے عمل کو سند جواز نہیں ملتی ہے۔

قرآن کریم میں ایک گروہ کی مذمت ان الفاظ میں کی گئی ہے: ''ثم قست قلوبكم من بعد ذلك فهي كالحجارة أو أشد قسوة'' (البقرة: ۲/ ۷۴)، (پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھر کی مانند ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک گروہ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے: ''فبما نقضهم ميثاقهم لعناهم وجعلنا قلوبهم قاسية'' (المائدة: ۵/ ۱۳)، (پس ان کی عہد شکنی کی بنا پر ہم نے ان پر لعنت کر دی اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا)۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے گناہوں کی سزا کے طور پر ان کے دل سخت کر دیئے گئے۔

اسلام نے جس طرح امن و جنگ کی حالت میں انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی تعلیم دی ہے اور بے زبان جانوروں کے حوالے سے بھی مہربانی کے رویہ کی تلقین کی ہے، اسی طرح اس نے نرمی کی بھی ترغیب دی ہے اور سختی کے انجام سے ڈرایا ہے: ''جو نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ تمام بھلائیوں سے محروم کر دیا گیا'' (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الرفق، حدیث نمبر: (۲۵۹۲) بہ روایت حضرت جریر بن عبداللہ البجلی۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الأدب، باب الرفق، حدیث نمبر: (۳۶۷۷) بہ روایت حضرت جریر بن عبداللہ البجلی)۔

''بے شک اللہ تعالیٰ نرم ہے وہ نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی پر ایسی نعمتیں عطا فرماتا ہے جو سختی پر نہیں عطا فرماتا'' (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل الرفق، حدیث نمبر: (۲۵۹۴) بہ روایت حضرت عائشہ سنن أبی داؤد، کتاب الجہاد، باب ماجاء في الهجرة، حدیث نمبر (۲۴۷۸) بہ روایت حضرت عائشہ)۔

''بے شک نرمی جس چیز میں بھی ہو لی اسے زینت ہی بخشے گی اور نرمی جس چیز سے بھی ہٹالی جائے گی اسے قبیح بنادے گی'' (صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل الرزق، حدیث نمبر: (۲۵۹۴) بہ روایت حضرت عائشہ۔ سنن أبی داؤد، کتاب الجہاد، باب ماجاء في الهجرة، حدیث نمبر: (۲۴۷۸) ی روایت حضرت عائشہ)۔

اسلام قول و فعل میں تشدد اور سختی کو درست نہیں ٹھہراتا۔ وہ اپنی دعوت کی تبلیغ میں حکمت، عمدہ نصیحت اور احسن طریقہ پر بحث و گفتگو کی تلقین کرتا ہے۔ اس کی یہی ہدایت دوسروں کے ساتھ سلوک اور معاملات میں بھی ہے: ''إدفع بالتي هي أحسن السيئة'' (المؤمنون: ۲۳/ ۹۶)، (تم برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہتر ہو)۔

اسلام صرف جائز امور ہی میں مادی قوت کے استعمال کو درست ٹھہراتا ہے۔ اس کے مطابق کسی قانونی سبب ہی سے انسانوں کے خون اور مال مباح ہوتے ہیں۔ اسلام صرف جنگ جو دشمن ہی کے ساتھ تشدد کو اور اسے بھی صرف دوران جنگ میں، جائز قرار دیتا ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے کے ساتھ تشدد میں پہل کرے، البتہ وہ تشدد کے جواب میں اسی کے بہ قدر کارروائی کرسکتا ہے۔ اسلام نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ تشدد کے جواب میں اپنے اوپر کئے گئے تشدد کی حد سے تجاوز نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام نے اسے عفو و درگزر کی ترغیب دی ہے: ''و إن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصابرين'' (النحل: ۱۶/ ۱۲۶)، (اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت بہتر ہے)۔

۲- اسلام جس طرح تشدد کی مذمت کرتا ہے اسی طرح طرح وہ دہشت گردی کی بھی مذمت کرتا ہے، کیونکہ دہشت گردی بھی تشدد ہی ہے بلکہ اس میں اضافہ ہے۔ تشدد یہ ہے کہ آپ اپنے فریق مخالف پر بے جا قوت کا استعمال کریں اور دہشت گردی یہ ہے کہ آپ قوت کا استعمال ایک ایسے شخص پر کریں جس کا آپ کے ساتھ کوئی تنازعہ نہ ہو جیسے ہوائی جہاز اغوا کرنا، یرغمالیوں کا اغوا اور سیاحوں کا قتل وغیرہ جنہیں نہ غوا کنندہ جانتا ہے اور نہ قاتل۔

ارہاب (دہشت گردی) عربی زبان میں ''أرہب یرہب'' کا مصدر ہے۔اس کے معنی ہیں۔دوسرے کوڈرانا، دہشت زدہ کرنا، خوف میں مبتلا کرنا۔اس لحاظ سے ارہاب لوگوں کے درمیان دہشت، ڈراور خوف پھیلانا نیز لوگوں کواس امن سے محروم کرنا ہے جو بندگان خدا پر خدا کا سب سے بڑاانعام ہے۔اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:''**فلیعبدوا رب هذا البيت الذى أطعمهم من جوع و آمنهم من خوف**'' (قریش:۱۰۶/ ۳-۴)،(توان کو چاہئے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا دیا اورخوف سے ان کوامن دیا)۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی دوایسی عظیم نعمتوں کا بیان ہوا ہے جو دو بنیادی انسانی ضروریات کی تکمیل کرتی ہیں۔یہ دونعمتیں ہیں: زندہ رہنے کے لئے غذا اورخوف کے مقابلہ میں امن۔

ایک معاشرہ کے لئے سب سے بدتر لعنت یہ ہے کہ اس سے یہ دونوں نعمتیں چھین لی جائیں اوراسے بھوک اورخوف میں مبتلا کردیا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:''**وضرب الله مثلاً قرية كانت آمنة مطمئنة يأيتها رزقها رغداً من كل مكان فكفرت بأنعم الله فأذاقها الله لباس الجوع والخوف بما كانوا يصنعون**'' (النحل:۱۶/ ۱۱۲)(اوراللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن واطمینان میں تھے،ان کوان کا رزق فراغت کے ساتھ ہرطرف سے پہنچ رہا تھا پھرانہوں نے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے ان کوان کے اعمال کے سبب سے بھوک اورخوف کا مزہ چکھایا)۔

حدیث شریف میں ''امن'' کوانسان کی تین بنیادی نعمتوں میں سے ایک شمار کیا لیا ہے۔انسان اپنی زندگی میں راحت وسکون کے حصول کے لئے ان نعمتوں کا شدید ضرورت مند ہے اور یہ تینوں نعمتیں ہرفرد کے لئے خوش حالی اورخوش بختی کی کلید ہیں:''آپؐ نے فرمایا:جس کی صبح اس حال میں ہو کہ اس کا دل تفکرات سے مطمئن ہو،اس کا جسم بیماریوں سے محفوظ ہواوراس کے پاس ایک دن کی غذا ہوتو گویا پوری کی پوری دنیا اس کی تحویل میں دے دی گئی (سنن الترمذی، کتاب الزہد، باب التوکل علی اللہ، حدیث نمبر: (۲۲۶۸) بہ روایت ابومحصن الخطمی۔امام ترمذی کہتے ہیں، یہ حدیث حسن ہے۔سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، باب القناعۃ حدیث نمبر: (۴۱۳۱) بہ روایت ابومحصن الخطمی)۔

اللہ تعالیٰ نے قریش اوراہل مکہ پر اپنا ایک احسان یہ جتایا ہے کہ اس نے ان کے حق میں حرم کوایک ایسی محفوظ و مامون پناہ گاہ بنادیا جہاں ایک شخص اپنے باپ کے قاتل کواپنے سامنے دیکھتے ہوئے بھی اس کے ساتھ برانہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:''**ومن دخله كان آمنا**'' (آل عمران:۳/ ۹۷)،(جواس میں داخل ہوجائے وہ مامون ہے)۔

''**أو لم نمكن لهم حرما آمنا يجبى إيله نمرات كل شئ**'' (القصص:۲۸/ ۵۷)،(کیا ہم نے ان کوامن وامان والے حرم میں جگہ نہیں دی جہاں ہرقسم کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں)۔

''**أولم يروا أنا جعلنا حرما آمناً و يتخطف الناس من حولهم**'' (العنکبوت:۲۹/ ۶۷)۔(کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ایک پرامن حرم بنایا اوران کے گردوپیش لوگ اچک لئے جاتے ہیں)۔

جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے ساتھ مصرتشریف لے گئے تو حضرت یوسف بن یعقوب علیہما السلام نے ان الفاظ کے ساتھ ان کا استقبال کیا:''**ادخلوا مصر إن شاء الله آمنين**'' (یوسف:۱۲/ ۹۹)(مصر میں ان شاءاللہ امن چین سے رہو)۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نیک بندوں کے لئے تیار کی گئی جنت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکمل امن کا مرکز ہے۔ اسی لئے ملائکہ اہل جنت کا استقبال ان الفاظ سے کریں گے:''**ادخلوها بسلام آمنين**'' (الحجر:۱۵/ ۴۶)۔(داخل ہوجاؤ ان میں امن اور

سلامتی کے ساتھ)۔

اسی طرح قرآن میں اہل جنت کے بارے میں کہا گیا ہے:"**ولاخوف علیهم ولاهم یحزنون**" (البقرة:۲/ ۶۲)۔(ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسی لئے اسلام نے ہر شخص کے لئے امن کی فراہمی کو شریعت کے بنیادی مقاصد میں شمار کیا ہے۔ اسی طرح اسلام نے عوام الناس کے امن کو خطرہ میں ڈالنے کو سب سے سنگین قابل سزا جرم قرار دیا ہے۔ اسی لئے شریعت نے چوری کرنے والے کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے۔ مال کو غصب کرنے پر اس طرح کی سزا مقرر نہیں کی جب کہ غصب ایک سنلین جرم ہے، کیونکہ چوری خفیہ طریقہ پر ہوتی ہے اور اس سے امن کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غصب علانیہ دن میں ہوتا ہے۔

اسی طرح اسلام نے لوٹ مار اور ڈکیتی کو سنگین جرم قرار دیا ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو اللہ ورسول سے جنگ کرنے والا اور زمین میں فساد برپا کرنے والا قرار دیا ہے:"**یحاربون الله و رسوله ویسعون فی الأرض فساداً**" (المائدہ:۵/ ۳۳)۔(جولوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد کے لئے دوڑتے ہیں)۔

اور اس جرم کی سزا یہ مقرر کی ہے:"**أن یقتلوا أو یصلبوا أو تقطع أیدیهم وأرجلهم من خلاف أو ینفو من الأرض**" (المائدہ:۵/ ۳۳)، (ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا وہ سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمت سے کاٹے جائیں یا ان کو ملک سے باہر نکال دیا جائے)۔

اس جرم کی اتنی سخت سزا مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ کے امن کو خطرہ سے دوچار کر دیتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ہر چہار جانب دہشت پھیل جاتی ہے۔

اس طرح یہ شہریوں کو دہشت زدہ اور خوف زدہ کرنے کا جرم ہے۔ اس لئے اس کی اتنی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ اسی طرح اسلام نے لوگوں کو خوف ودہشت میں مبتلا کرنے کے ہر عمل کو خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، ان جرائم اور گناہوں میں شامل کیا ہے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور جن کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے آخرت میں سزا مقرر کی ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ ایک حدیث میں ہے،" وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ اسی دوران میں ایک شخص کو اپنی سواری ہی پر بیٹھے بیٹھے غنودگی آ گئی اور ایک دوسرے شخص نے از راہِ مذاق اس کے ترکش کا ایک تیر لے لیا۔ اب وہ شخص بیدار ہوا تو ڈر گیا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا:" کسی کے لئے جائز نہیں کہ ایک مسلمان کو خوف میں مبتلا کرے"(سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب من یأخذ الشئ علی المزاح، حدیث نمبر:(۴۳۵۱) بہ روایت حضرت عبدالرحمٰن بن أبی لیلی، مسند احمد، کتاب مسند الأنصار، باب أحادیث رجال من أصحاب النبی، حدیث نمبر:(۲۱۹۸۶) اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں)۔

یہاں اگرچہ ڈرانے کا مقصد مذاق وتفریح کرنا تھا اور سوائے اس کے کہ اونگھنے والا بیدار ہونے کے بعد یہ سوچ کر کہ کوئی شخص اس کے ترکش سے کچھ لینا چاہتا ہے، ڈرا اور سہما، اس ڈرانے کے نتیجہ میں اسے کوئی ایذا نہیں پہنچی مگر اس کے باوجود آپؐ نے اس تخویف کو حرام قرار دیا۔

آپؐ کے ارشاد:" ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو خوف میں مبتلا کرے"(سنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب من یأخذ الشئ علی المزاح، حدیث نمبر:۴۳۵۱) بہ روایت عبدالرحمٰن بن ابی لیل۔ مسند احمد۔ کتاب مسند الأنصار، باب أحادیث رجال من أصحاب النبی، حدیث نمبر:(۲۱۹۸۶)۔ اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں) کا مطلب یہ نہیں کہ یہ صرف مسلمانوں کے حق میں حرام ہے۔ یہ حدیث ان الفاظ میں اس لئے نقل ہوئی ہے کہ یہ وقاعہ

ایک مسلمان کی طرف سے دوسرے مسلمان کے ساتھ پیش آیا۔ رہی یہ بات کہ امن سے رہ رہے لوگوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کرنے کا کیا حکم ہے تو یہ عمومی طور پر ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے رسولؐ نے ارشاد فرمایا: "مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے خون اور اپنے مال میں محفوظ و مامون ہوں (سنن الترمذی۔ کتاب الإیمان، باب ماجاء فی أن المسلم من سلم المسلمون، حدیث نمبر: (۲۵۵۱)، بہ روایت حضرت ابو ہریرہ۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ سنن النسائی، کتاب الإیمان، وشرائعہ، باب صفۃ المؤمن، حدیث نمبر: (۴۹۹۵) بہ روایت حضرت ابو ہریرہ)۔

اس طرح آپؐ نے کسی کو اس وقت تک سچے ایمان سے متصف قرار نہیں دیا جب تک کہ بشمول مسلم غیر مسلم تمام انسان اپنے تقدس، اپنی عزت و آبرو اور اپنے مال میں اس سے محفوظ و مامون نہ ہوں۔

اسلام اور تہذیب:

ہمارا ایمان ہے کہ اسلامی تہذیب میں زمین آسمان سے اور ربانی اقدار انسانی مقاصد سے مربوط ہیں۔ اس تہذیب میں اسلام کی حقیقت اور زمانہ کی روح دونوں ہی نمایاں ہیں۔ یہاں علم اور ایمان ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ اس تہذیب میں حق اور قوت کا امتزاج ہے۔ یہاں مادی تخلیقیت اور اخلاقی بلندی دونوں کا توازن ہے اور اس تہذیب میں عقل کی روشنی اور وحی کا نور باہم شیر و شکر ہیں۔

ایک ایسی تہذیب جس میں اسلام کے اساسی اصول و خصائص کی نمایاں جھلک موجود ہے۔ اس تہذیب میں فرد کی تربیت، خاندان کی تشکیل، معاشرہ کے استحکام، ریاست کے قیام اور درست راستہ کی طرف انسانیت کی رہنمائی کے حوالے سے اسلام کے مقاصد و مناہج کی عملی تصویر پوری طرح واضح ہے۔

ایک ایسی تہذیب جو ایک طرف مادہ پرستانہ الحادی کمیونسٹ کیمپ کی تہذیب سے اور دوسری طرف خودغرض سیکولر سرمایہ دارانہ کیمپ کی تہذیب سے پوری طرح ممتاز ہے۔ ایک ایسی تہذیب جو نہ دائیں بازو سے منسوب ہے اور نہ بائیں بازو سے بلکہ صرف اور صرف اسلام سے منسوب ہے۔ اسی سے استفادہ کرتی ہے، اسی کو اپنا سہارا بناتی ہے، اسی کو اپنا نصب العین قرار دیتی ہے، اسی کے ذریعہ متحرک اور سرلرم ہوتی ہے اور اسی کے آئینہ میں اپنی جھلک دکھاتی اور اپنے کو نمایاں کرتی ہے۔

یہ تہذیب اپنے امتیازی خصائص کے ساتھ ساتھ مختلف النوع تمدنوں کے درمیان ہم آہنگی، تہذیبوں کے درمیان مذاکرات، اقوام عالم کے درمیان باہمی تعارف اور اولاد آدم، وہ جہاں کہیں بھی ہوں، کے درمیان باہمی اخوت پر ایمان رکھتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا**" (الحجرات: ۴۹/۱۳) (اور ہم نے تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)۔

مگر یہ تہذیب دوسری تہذیبوں میں گم ہو جانے اور اپنی اصل شناخت اور امتیازی خصوصیات کو کھو دینے کی شدید مخالف ہے۔ اسی لئے یہ ہر قسم کے ثقافتی حملہ، تہذیبی لوٹ کھسوٹ اور غیر ملکی قبضہ کو سختی سے مسترد کرتی ہے اور ان ٹیڑھے میڑھے حربوں سے نبرد آزما ہے جن کا استعمال کر کے آج کے جارحیت پسند حملہ آور ہو رہے ہیں اور اسلامی تہذیب کی اصل شناخت کو مٹا دینا چاہتے ہیں، اس کی امتیازی خصوصیات کو تبدیل کر دینا چاہتے ہیں اور "کائناتی کلچر" کے نعرہ کی آڑ میں اس کے عقیدہ کو جو اس کے متیاز کی اساس ہے، ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ یہ ایک نیا سامراج جسے ہم دین کے حوالہ سے مسترد کرتے ہیں۔

ہم آج کی مروجہ مغربی تہذیب کے علم برداروں کے درج ذیل رجحانات کے شدید مخالف ہیں:

۱- مادہ پرستانہ فلسفہ: یہ وہ نظریۂ زندگی ہے جو صرف محسوسات پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ فلسفہ بہ قول لیو پولڈ فائس (محمد اسد) نہ غیب پر ایمان رکھتا ہے اور نہ اس کے فکری نظام میں خدا کے لئے کوئی جگہ ہے۔

جب تک خدا اس فلسفہ میں غیر موجود رہے گا اس وقت تک اس کا سامنا کرنے، اس کے حضور احتساب کے لئے پیش ہونے اور اخروی جزا و سزا کے لئے اس کے کلچر میں کوئی قابل ذکر مقام نہ ہوگا۔

۲- اباحیت پسندانہ فلسفہ: یہ نظریہ کسی بھی مذہب و اخلاق سے قطع نظر لذت پرستی اور وہ بھی صرف جسمانی لذت پر مبنی ہے۔ اسی لذت پرستی کی بنا پر اس نے ان چیزوں کو بھی جائز کر لیا ہے جن کو تمام آسمانی مذاہب نے حرام ٹھہرایا تھا جیسے زنا اور ہم جنسی۔

۳- مفاد پرستانہ فلسفہ: یہ نظریہ اعلیٰ اقدار اور خالص اخلاقی مثالیت کا مخالف ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اخلاق ایک اضافی چیز ہے۔ یہ نظریہ اخلاق کو ہمہ گیر، قطعی اور دائمی نہیں مانتا۔ اس نظریہ کی رو سے جو چیز کل نیکی تھی وہ آج بدی میں تبدیل ہو سکتی ہے اور جسے آج ہم بدی قرار دے رہے ہیں وہ کل نیکی بن سکتی ہے۔

۴- نسل پرستانہ رجحان: یہ رجحان انسانوں کے درمیان نسل اور رنگ کی بنیاد پر امتیاز کرتا ہے۔ ایک ایسے نسلی امتیاز کے نظریہ کی بنا پر جو نہ کسی قطعی علم پر مبنی ہے اور نہ کسی مذہب پر، یہ رجحان گوروں کو دنیا کا آقا قرار دیتا ہے اور یہ تصور کرتا ہے کہ یوروپی اقوام حکومت اور سرپرستی کرنے ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں جب کہ اس رجحان کے مطابق دنیا کی دیگر تمام اقوام محکوم بننے اور غلام رہنے ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس کے برعکس ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں جیسے کنگھی کے دانے۔ ان سب کا پروردگار بھی ایک ہے اور سب کا باپ بھی ایک۔

۵- برتری کا رجحان: یہ رجحان بھی سابقہ رجحان ہی سے پیدا شدہ اور اسی کا نتیجہ ہے۔ یہ رجحان یوروپی اقوام کے دنیا پر مسلط ہونے اور دنیا کے خام وسائل پر قابض ہو کر ان کے اجارہ دار بننے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے یوروپی اقوام پوری دنیا کے سرمایے اور وسائل و ذرائع کو اپنے قبضہ میں لینا اور انہیں اپنے اپنے قومی مفادات کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہی بنیاد ہے جس پر قدیم سامراج بھی قائم تھا جس نے یوروپ کے مفاد کے لئے پوری دنیا کو لوٹا۔ اب جدید سامراج بھی پوری دنیا کو امریکہ کے مفاد کے لئے اپنا تابع بنانا چاہتا ہے۔ یہ سامراج بہ طور خاص عالم اسلام کو اپنا ماتحت اور محکوم بنانا چاہتا ہے۔ اسی سامراج نے سوویت یونین کی جگہ عالم اسلام کو امریکہ کا متبادل دشمن بنا کر پیش کیا ہے۔ تہذیبوں کی کشمکش کے نظریہ کے حامل پالیسی ساز فلاسفہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی تہذیب ہی وہ پہلی تہذیب ہے جس سے مغربی تہذیب کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہے۔ لہٰذا اہل مغرب کو اس خطرہ سے آگاہ کرنا اور اس خطرہ کی گھات میں لگے رہنا بہت ضروری ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اسلام صرف اتنی سی چیز کو کافی نہیں سمجھتا کہ امت مسلمہ محض اپنے ماضی کی روشن تہذیب کا گن گاتی رہے بلکہ اسلام ایک جدید اور ہم عصر اسلامی تہذیب کی تخلیق و تشکیل کے لئے سرگرم عمل ہونے کی دعوت دیتا ہے یعنی ایک ایسی تہذیب کی تشکیل کی دعوت جو موجودہ تہذیب کے تمام اچھے پہلوؤں کو اپنی تہذیب میں شامل کر لے جیسے سائنس، ٹکنالوجی، عمدہ تنظیم اور حسن انتظام، یہ اسی طرح کا ایک استفادہ ہے جیسا اہل یوروپ اس سے پہلے ہماری تہذیب سے کر چکے ہیں، کیونکہ سائنس اپنی فطرت کے اعتبار سے عالمی اور کائناتی ہے، مذہب، ملک اور نسل کے اختلاف سے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو چیز اقوام، ان کے مذاہب ان کے ورثوں اور ان کے فلسفہ ہائے زندگی کے فرق سے بدلتی ہے وہ ہے کلچر (Culture)۔

مادی تخلیقیت کے وسائل سے استفادہ کر رہی ہماری موجودہ اسلامی تہذیب کا سرچشمہ ہمارا اسلامی کلچر ہے جو ایک طرف انسانی عقل پر مبنی ہے اور دوسری طرف وحی الٰہی کا فیض یافتہ ہے۔ یہ اسلامی تہذیب انسانیت کی خدمت میں ایک ایسا جدید نظام زندگی پیش کرتی ہے جو

اپنے جامع ترین تصور کے مطابق اس کی دنیوی کامیابی کا ضامن ہے؟ انسان کے فرض منصبی کی ادائیگی اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں اس کا معاون ہے اور حق وانصاف کے اصولوں پر مبنی عالمی امن کے قیام کے لئے ٹھوس بنیادیں فراہم کرنے اور اسے مستحکم کرنے میں دوسرے تمام لوگوں کا شریک کار ہے۔

اسلام اور اصلاح:

۱- ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق بہترین ساخت پر کی: "**لقد خلقنا الإنسان فی أحسن تقویم**" (التین: ۹۵/ ۴)۔ (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا جانشین بنایا تا کہ وہ اسے آباد کرے اور اس کی اصلاح کرے: "**هو أنشأكم من الأرض واستعمركم فيها**" (ہود:۱۱/ ۶۱)۔ (اس نے تم کو زمین سے بنایا اور اس میں تم کو آباد کیا)۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء اور رسولوں کو یہ ذمہ داری تفویض کی کہ وہ انسانوں کے سامنے اللہ کی وحدانیت اور اس کی بندگی کی دعوت پیش کریں پھر اس کے بعد ان کی اصلاح کا اور فساد کے ازالہ کا فریضہ انجام دیں: "**ومانرسل المرسلين إلا مبشرين و منذرين فمن آمن وأصلح فلا خوف عليهم ولاهم يحزنون**" (الأنعام:۶/ ۴۸)۔ (اور ہم رسولوں کو صرف خوش خبری دینے والے یا ڈرانے والے کی حیثیت سے بھیجتے ہیں پھر جو ایمان لایا اور اپنی اصلاح کی تو ان کے لئے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے)۔

اللہ کے نبی حضرت شعیب علیہ السلام نے تو اپنی قوم مدین کو اقتصادی اصلاح کے بہت سے پہلوؤں کی طرف متوجہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "**وإلى مدين أخاهم شعيباً قال يا قوم اعبدوا الله مالكم من إله غيره ولاتنقصوا المكيال والميزان إني أراكم بخير و إني أخاف عليكم عذاب يوم محيط و يا قوم أوفوا المكيال والميزان بالقسط ولاتبخسوا الناس أشيائهم ولاتعثوا في الأرض مفسدين**" (ہود:۱۱/ ۸۴-۸۵)۔ (اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو شعیب کو بھیجا، اس نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو، میں تم کو اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں اور میں تم پر ایک گھیر لینے والے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں اور اے میری قوم ناپ اور تول کو پورا کرو انصاف کے ساتھ اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین پر فساد نہ مچاؤ)۔

یہاں تک کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے توحید کے بعد اپنی رسالت کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: "**إن أريد إلا الإصلاح ما استطعت**" (ہود:۱۱/ ۸۸)، (میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک ہو سکے)۔

اسی لئے اہل ایمان کو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت دی جاتی رہی: "**ولاتفسدوا في الأرض بعد إصلاحها وادعوه خوفاً و طمعاً**" (الأعراف:۷/ ۵۶)، (اور زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد اور اسی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ)

قیامت تک جاری سنت الٰہی کے حوالہ سے ربانی ہدایت یہ ہے کہ چونکہ اصلاح ایک ایسا مشکل عمل ہے جسے مفسدین انجام نہیں دے سکتے، اس لئے ضروری ہے کہ انسان پہلے اپنی اصلاح پر توجہ دے تا کہ بعد میں معاشرہ کی اصلاح میں اپنا کردار ادا کر سکے: "**إن الله لايصلح عمل المفسدين**" (یونس:۱۰/ ۸۱)۔ (اللہ یقیناً مفسدوں کے کام کو سدھرنے نہیں دیتا)۔

۲- ہمارا ایمان ہے کہ عالم اسلام میں جاری ہمہ گیر اصلاح کی تحریک ہر گزرے ہوئے وقت سے زیادہ آج کی ضرورت ہے۔ یہ

اصلاحی تحریک موجودہ دنیا کے احوال وظروف سے کٹ کر نہیں رہ سکتی۔ آج جب کہ پوری دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے، قوموں اور تہذیبوں کے درمیان رابطہ اور باہمی تعامل اس زمانہ کی ایک نمایاں علامت بن چکے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک میں جاری اصلاح کی تحریک مسلم یا غیر مسلم معاشروں میں ہو رہے زبردست انسانی تجربات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ غیر مسلم معاشروں نے سیاسی اصلاح کے میدان میں بہت سے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جن کی وجہ سے انہیں استحکام نصیب ہوا ہے اور اس سیاسی استحکام کے نتیجہ میں ہونے والی ترقی نے انہیں دنیا کی قیادت کے منصب کا اہل بنا دیا ہے۔ اس ضمن میں ہمارا یہ کہنا فطری ہو لا کہ ہمارے ممالک کی تحریک اصلاح ہمارے مقدس ومعصوم اسلامی اصولوں سے گریز نہیں کر سکتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان ہی اصولوں سے استفادہ کرے اور ان ہی کی پابند رہے۔ تجدد پذیر بشری فہم کی روشنی میں اسے قدماء کے پیش کردہ عظیم سرمایہ کے حوالہ سے جمود کا طریقہ چھوڑنا ہوگا تا کہ وہ جدید دور کے مسائل و مشکلات کے حل سے قاصر نہ رہ جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان پر مضبوطی سے قائم رہوں گے کبھی گمراہ نہ ہوگے: ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے پیغمبر کی سنت'' (اس حدیث کی روایت حاکم نے حضرت ابن عباس سے کی ہے اور اسے سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیا ہے۔ بیہقی نے اسی حدیث کو حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ بیہقی کے الفاظ یہ ہیں: میں نے تم میں دو چیزڈں چھوڑی ہیں۔ تم ان دونوں کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ اللہ کی کتاب اور میری سنت۔ یہ دونوں چیزیں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ وہ دونوں میرے پس حوض پر آئیں)۔

۳- ہمارا ایمان ہے کہ علمی سطح پر اب یہ طریقہ مقبول نہیں رہا کہ موجودہ مسلم معاشروں کے مسائل کو معمولی بنا کر پیش کیا جائے یا ان کے بحران کو اخلاق واقدار، یا مسئلہ حدود وتعزیرات تک محدود رکھا جائے اگرچہ بجائے خود یہ مسائل بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئ وھدی و رحمة و بشری للمسلمین**'' (النحل:۱۶/۸۹) (اور ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے ہر چیز کو کھول دینے کے لئے۔ وہ ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے فرماں برداروں کے لئے)۔

لیکن اصلاح کا فریضہ انجام دینے والوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ موجودہ انسانی سماج کے مشکل مسائل، ان کے متنوع پہلوؤں اور ان کے باہمی ربط وتعلق کو نظر انداز کریں۔ تسلسل کے ساتھ جاری سائنسی اور صنعتی انقلابات، اسی طرح پیداوار نقل وحمل، مواصلات، اطلاعات کی منتقلی، ان کو محفوظ کرنے اور ان کو استعمال کرنے کے وسائل وذرائع میں ہونے والی زبردست ترقی، ان تمام امور نے نئی سماجی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسی طرح ان تبدیلیوں نے بہت سے قدیم مسائل میں ایسے ایسے پہلو نکال لئے ہیں جن سے اب تک سماج ناآشنا تھا۔ اس وقت اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اقتصادی پس ماندگی کی صورت حال سے باہر نکلنے کی کوشش کی جائے۔ ترقی کی منصوبہ بندی کی جائے، دنیا میں غذائی قلت اور غذائی اشیاء کے غلط تقسیم کا ازالہ کیا جائے، ماحولیات اور ان کی آلودگی کے مسائل حل کئے جائیں۔ مسلم ممالک میں سرمایے کی ناجائز تقسیم کو روکا جائے، بیش تر مسلمان ممالک میں سماجی تعاون کے نظام کے فقدان کی صورت حال سے نمٹا جائے، مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کے راستہ کی رکاوٹوں کو ختم کیا جائے اور چند منٹوں میں پوری انسانی تہذیب کو مٹا ڈالنے والے اور دنیا کی تمام اقوام کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والے ہمہ گیر اور وسیع تباہی کے ہتھیاروں کی دوڑ پر پابندی لگائی جائے۔ اسی طرح اسلام کی اصلاحی تحریک اور نفاذ شریعت کے علم برداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورت حال پر بھی نظر رکھیں کہ دنیا کے چند بڑے بڑے ممالک کمزور اقوام کے حقوق اور دوسری تہذیبوں کو نظر انداز کر کے اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلام کی اصلاحی تحریک کو ان جیسے امور پر بھی گہری توجہ دینی ہوگی اور انہیں نظر انداز کرنا درست نہ ہوگا۔

۴-ذاتی اصلاح:

ہمارا ایمان ہے کہ اتحاد امت کی ضامن اور خیر وترقی کی طرف امت کی رہنمائی کرنے والی حقیقی اصلاح دراصل اس کی خود کی وہ اصلاح ہے جس کا سرچشمہ امت کے مسلمات اور اس کے مصالح ہیں۔ ذات (خود) کی یہ اصلاح اسلام کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے نہ کہ اصلاح کے نام پر اسلام کو دور کر کے یا اس میں تحریف واضافہ کر کے۔ اصلاح کو حربے کے طور پر اختیار کرنے والی بیرونی تحریکات کا مقصد دراصل یہ ہے کہ امت کی مختلف طاقتوں کو باہم متصادم کردیا جائے تاکہ امت مسلسل کمزور ہوتی رہے اور اس پر اغیار کا تسلط برقرار رہے۔ اصلاح کی کامیابی کا اہم ترین ذریعہ رہنما طبقات کا اصلاح کے بنیادی نکات پر باہم متفق ہونا اور اسے بروئے کار لانے کے لئے امت کے قائدین کا باہم تعاون کرنا ہے۔

آج عالم اسلام کے ہر خطہ کے علماء سے اس بات کا مطالبہ ہے کہ وہ ہمہ گیر اصلاح کا علم بلند کریں، امت کو اصلاح کے حوالے سے بیدار کریں اور تسلسل کے ساتھ اصلاح کی راہ پر آگے بڑھتے رہنے کے لئے اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ یہ مقصد پوری طرح اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ علماء پوری امت کی فکر کریں اس کے اہم ترین مسائل کا احاطہ کریں اور ان کا ایسا حل پیش کریں جو اسلام سے ہم آہنگ ہو۔ ان مسائل کے حل کے لئے وہ ایک ایسے فقہی اور فکری دائرہ میں اجتہاد کریں جو موجودہ دور کے حوالے سے اپنے اندر وسعت رکھتا ہو، دوسروں کے تجربات سے مستفید ہوتا ہو اور شریعت کے مبادیات، اس کے اصول اور اس کے مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

اسی طرح امت کے حکمراں طبقات کو بھی یہ جان لینا چاہئے کہ صرف حقیقی اصلاح ہی کے نتیجہ میں انہیں اقتدار میں برقرار رہنے کا جواز مل سکتا ہے۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اب مصالح امت کا تقاضہ یہی ہے کہ صدیوں سے حاشیے پر رہی امت کو دور جدید کی طرف لوٹ آنا چاہئے تاکہ وہ از سر نو اپنی اسلامی زندگی کا اور اپنے انسانی پیغام کی اشاعت کا آغاز کر سکے۔ اب اسے چاہئے کہ قانون سازی اور نفاذ شریعت کے ذریعہ تبدیلی اور اصلاح کو بروئے کار لانے میں اپنا مطلوبہ کردار ادا کرے۔

ایک طرف ارباب حکومت اور علماء نیز عوامی حلقوں اور سول سوسائٹی کے درمیان اور دوسری طرف خود حکمراں طبقات کے درمیان باہمی تعاون اور تال میل ہونا چاہئے۔ صف ایک ایسی یک جہتی ہی اصلاح کے عمل کو بہ روئے کار لانے میں پوری امت کے اتحاد کی ضامن ہوسکتی ہے۔ امت کے مختلف مکاتب فکر، اس کی مختلف پارٹیوں یا اس کی بنیادی طاقتوں یا اس کے ارباب اختیار کے درمیان کسی بھی قسم کا اختلاف بیرونی مداخلت کا دروازہ پوری طرح کھول دے گا جس کے نتیجہ میں اصلاح کی تمام مساعی اکارت چلی جائیں گی اور دشمنوں کے مقاصد پورے ہوجائیں گے۔ کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بیرونی طاقتوں سے تعاون حاصل کرنے کے نتیجہ میں اصلاح کا عمل تیز رفتاری سے آگے بڑھے گا لیکن ایسے لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ بیرونی طاقتیں حقیقی اصلاح کے عمل میں ہرگز معاون نہیں ہوں گی۔ وہ صرف اپنا یہ مقصد پورا کرنا چاہتی ہیں کہ امت مسلمہ زیادہ سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو اور ان کی تابع فرمان بن کر رہے۔

۵-سیاسی اصلاح:

مسلم ممالک میں سیاسی اصلاح کو خصوصی اہمیت دینا ضروری ہے، کیونکہ ان ممالک میں ایک مستحکم سیاسی نظام کی تشکیل کا واحد راستہ یہی ہے۔ یہی اصلاح تمام شعبوں میں اصلاحی عمل کو بہ روئے کار لانے میں معاون ہوگی۔ اسی کے ذریعہ دشمنوں کے مقابلے میں امت کی

وحدت کا تحفظ ہوگا اور اسے چھوٹی سلطنتوں اور ٹکڑیوں میں تقسیم ہونے سے بچایا جاسکے گا ورنہ امت متحارب گروہوں میں منقسم ہوکر ایک دوسرے سے مقابلے کے لئے بیرونی دشمنوں سے مدد لینے لگے گی۔

مسلم ممالک بلکہ دنیا کے تمام ملکوں میں سیاسی اصلاح کی تین اہم بنیادیں ہیں:

اول: سیاسی سرگرمیوں کی آزادی: یہ آزادی تمام باشندگان وطن کو حاصل ہونی چاہیے۔اسی کے ساتھ ساتھ تمام بنیادی انسانی حقوق اور بہ طور خاص ہر ایک کے لئے رائے دہندگی، اظہار رائے اور اپنی رائے کی اشاعت کے لئے تنظیمیں یا ادارے قائم کرنے کے حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے۔آزادی کا یہ دائرہ متعدد سیاسی پارٹیوں کے قانونی جواز، ان کے درمیان مسابقت کی تنظیم اور دوسروں کی رائے کے احترام تک وسیع ہے۔

دوم: امت کو اقتدار کا سرچشمہ قرار دینا:

اقتدار کا وجود اور اس کا تسلسل عوامی امنگوں کے تابع ہو۔اقتدار کی پُر امن منتقلی کو ایک ایسے قانونی دائرہ کے تابع کر دیا جائے جس سے اتحاد امت کا تحفظ ہو سکے اور لوگوں کو اپنا ماتحت بنانے، ان پر ظلم و جبر کرنے اور ان کے حقوق چھیننے کے لئے حکومتی ذرائع کا استعمال نہ کیا جاسکے، اسی طرح اختیارات کو مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ایک ہی ہاتھ میں ان کا ارتکاز آمریت کا رخ نہ اختیار کر لے نیز عسکری ادارے اور سلامتی کے شعبے پوری امت کے دفاع کے لئے مخصوص ہوں نہ کہ کسی حکومت کے لئے۔

سوم: قوم کو انتظامیہ کی نگرانی اور سیاسی سطح پر اس کے احتساب کا موقع دیا جائے:

عدلیہ کو پوری طرح آزاد رکھا جائے اور اسے تمام حکام کے احتساب کے اعلیٰ اختیارات حاصل ہوں۔اس طریق کار سے افسران کی اپنے فرائض کی ادائیگی میں شفافیت کو یقینی بنایا جاسکے گا اور ان کو شخصی یا طبقاتی مفادات کے حصول کے لئے اپنے مناصب کے غلط استعمال سے روکا جاسکے گا۔

ان اصلاحات کو بہ روئے کار لانے کے نتیجہ میں سیاسی زندگی افہام و تفہیم اور باہمی تعاون پر مبنی ہوگی اور انتہا پسندی نیز داخلی کشمکش کے اسباب و محرکات کا خاتمہ ہو سکے گا۔ان اصلاحات کی تکمیل کے ذریعہ دشمنوں کے مقابلہ میں اسی طرح امت کے وسائل و ذرائع کو فروغ دینے اور اس کے مستقبل کی تعمیر کے حوالے سے منصوبہ بندی میں پوری امت بہ شمول حکام اور عوام کے اتحاد کو یقینی بنایا جاسکے گا۔ان اصلاحات کی تنفیذ مختلف مسلم ممالک کے درمیان تعاون کے حوالے سے کئے جانے والے سنجیدہ اقدامات میں معاون ہوگی اور اس کے نتیجہ میں ایک مناسب وحدانی نظام تک رسائی حاصل ہو سکے گی۔

۴: اقتصادی اصلاح:

ملکوں کی ترقی، اپنی بالادستی کے تحفظ کی قدرت صلاحیت اور دیگر ملکوں تک ان کے اثر و رسوخ کے وسیع ہونے کا اہم ترین ذریعہ مضبوط اقتصادی نظام ہے۔امت کی زندگی میں سیاسی استحکام اس کی اقتصادی قوت کی اولین اساس ہے۔مسلم ممالک میں اقتصادی اصلاح کے ذریعہ درج ذیل مسائل حل کئے جانے چاہئیں:

علمی تحقیقات: اب اقتصادی سرگرمیاں محض آزادانہ مسابقت تک محدود نہیں رہیں بلکہ اس دور میں علمی تحقیقات ہر اقتصادی ترقی کی

اساس بن چکی ہیں۔

اسی طرح یہ علمی تحقیقات ہر تہذیبی ارتقاء کی بھی اساس ہیں۔ ہمارے مسلم ممالک دو وجوہ سے اس شعبہ میں بڑی پس ماندگی کا شکار ہیں:

اول: بہت سے تخلیقی دماغوں کا ان ممالک میں منتقل ہوجانا جہاں سیاسی استحکام ہے۔ایک انسان ان ممالک میں اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے، اسی طرح وہ ان ممالک میں اپنے منصوبوں کو بہ روئے کار لاسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسے ذہین ترین دماغ اپنی علمی تخلیقات سے ان ممالک کو مالا مال کررہے ہیں جب کہ ان اپنی قوم ان خدمات کی زیادہ ضرورت مند ہے۔

دوم: ان تخلیقات کے لئے مناسب بجٹ کا مختص نہ ہونا۔ کبھی کبھی تو سرے سے کوئی بجٹ ہوتا ہی نہیں۔اگر حکام میں سچا عزم ہو تو ان دو اسباب کا ازالہ اور ایک نئی علمی پیش رفت مشکل نہیں ہے۔

ترقی اور صنعت کاری:

ہمارے بیش تر مسلم ممالک پس ماندہ قرار دیئے جاتے ہیں۔انہیں کبھی کبھی ترقی پذیر ممالک بھی کہا جاتا ہے لیکن ان میں سے بیش تر کسی بھی قسم کی ترقی اور پیش رفت سے نا آشنا ہیں۔ ہمیں ایسی سنجیدہ تحقیقات کی ضرورت ہے جن کے ذریعہ ہمارے فطری وسائل کی روشنی میں اقتصادی ترقی کا ایک جامع منصوبہ تشکیل دیا جاسکے۔ ہمارے پاس ان تحقیقات کو انجام دینے کے لئے ماہر اقتصادیات دماغوں کی کمی نہیں ہے۔ اسی طرح ہمارے ممالک اپنے فطری وسائل و ذرائع کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ممالک میں شمار ہوتے ہیں، مگر ہمیں ایک ایسے مستحکم اور سنجیدہ سیاسی نظام کی ضرورت ہے جو ان منصوبوں کو روبہ عمل لا سکے اور بیرونی طاقتوں کے پیدا کردہ اندرونی انتشار سے جن سے فائدہ بھی صرف وہی طاقتیں ہی اٹھاتی ہیں اپنے کو بچانے کے نام پر ان کو نظر انداز کردے۔ فی الواقع یہ کتنی بڑی کمی ہے کہ ہمارے بیش تر ممالک اب تک صنعت کاری کے دور میں داخل بھی نہیں ہوسکے ہیں اور ابھی تک اپنی ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اپنے دشمنوں ہی سے خرید رہے ہیں، کجا کہ بڑی بڑی سیول اور عسکری صنعتیں شروع کرتے۔

اقتصادی تعاون:

آج بیش تر مسلم ممالک کے درمیان اقتصادی تعلقات ان کے غیر مسلم ممالک سے تعلقات کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور ہیں، حالانکہ اگر تمام مسلم ممالک ایک مشترک اقتصادی بازار میں تبدیل ہوجائیں جہاں سامان تجارت، مصنوعات، تجربات اور بنیادی اشیاء کا تبادلہ قدرے آسانی کے ساتھ اور ٹیکس کے بغیر یا معمولی ٹیکس کے ساتھ ہو تو اس سے ان ممالک کی اقتصادی ترقی میں بڑی مدد ملے گی اور عالم اسلام ایک بڑی اقتصادی قوت بن کر ابھرے گا۔شاید اس ضمن میں سات مسلم ممالک کے ذریعہ کیا گیا تجربہ اس حقیقت کا سب سے پختہ ثبوت ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ یہ تجربہ آگے تو کیا بڑھتا، برقرار بھی نہ رہ سکا۔ اس کے اسباب بھی سب کو معلوم ہیں۔ عالم اسلام کے مختلف ممالک کے درمیان اقتصادی تعاون ایک اساسی قدم ہے جو بہ تدریج ایک ایسی اقتصادی اکائی میں تبدیل ہوجائے گا جس سے سب کے سب مستفید ہوں گے، مگر اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عالم اسلام میں ایسی مستحکم حکومتیں قائم ہوں جو اپنا فیصلہ خود کرنے پر قادر ہوں اور اپنے ممالک کی ترقی کا عزم مصمم رکھتی ہوں۔

عوامی اقتصادی مقاطعہ:

آج عالم اسلامی کی اشیائے صرف کا ایک بڑا حصہ بیرونی ممالک کی پیداوار پر مشتمل ہے اور ان ممالک میں سے بعض تو دشمنوں کی فہرست میں ہیں۔ یہ صورت حال ایک طرف ان ممالک کی اقتصادیات کو تقویت پہنچانے اور دوسری طرف مسلم ممالک کی اقتصادی پس ماندگی کو برقرار رکھنے میں معاون ہے۔

علاوہ ازیں اگر اس میں یہ پہلو بھی شامل کرلیا جائے کہ بعض بیرونی ممالک کی اقتصادی قوت کو ہم سے طاقت بھی مل رہی ہے اور اسی کے ساتھ ہماری امت اور اس کے جائز حقوق بہ طور خاص مسئلہ فلسطین کے حوالہ سے ان کی معاندانہ پالیسیاں بھی مسلسل جاری ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کی مدد اس لئے کررہے ہیں تاکہ وہ ہم پر حملے کے قابل ہوسکیں۔ مختصراً یہ کہ غیر ملکی سامانوں کے مقاطعہ کی تحریک جب تک کہ ہمارے مسلم ممالک میں ان کا متبادل موجود ہے آج ہماری قومی اقتصادیات کی تعمیر اور اس کی ترقی کا ایک بنیادی ذریعہ بن سکتی ہے۔ امریکی اور صہیونی سامانوں، صہیونی نظام کی حمایت کرنے والی کمپنیوں کے مقاطعہ کی تحریک آج اس حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے کہ ہم اسلامی اخوت کے تقاضوں سے اپنی وابستگی کے لئے پابندعہد ہیں۔ اگر ہماری تمام مسلم اقوام اس تحریک سے وابستہ ہوجائیں تو اس کے غیر معمولی اور دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

اسلام اور مذاکرات:

ہمارا ایمان ہے کہ ہمیں بہ حیثیت مسلمان دینی طور پر دوسروں کے ساتھ مذاکرات کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ دعوت اسلامی کے اس نظام کا ایک حصہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ اور آپؐ کے بعد ہر مسلمان کو دیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''**ادع إلى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة و جادلهم بالتي هي أحسن**'' (النحل:۱۶/ ۱۲۵)، (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو)۔

اس آیت میں قرآن نے صرف اتنی ہدایت پر اکتفا کیا ہے کہ نصیحت عمدہ ہونی چاہئے۔ اسی طرح قرآن نے مباحثہ میں بھی صرف احسن طریق ہی کو پسند کیا ہے، کیونکہ نصیحت ہم خیال افراد کو کی جاتی ہے اور مباحثہ اختلاف رائے رکھنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ انہیں نرم لہجہ اور ہمدردی سے پُر الفاظ سے مخاطب کیا جائے تاکہ انہیں مانوس اور مسلمانوں سے قریب کیا جاسکے۔

جو شخص قرآن کریم کا مطالعہ تدبر کے ساتھ کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ یہ مذاکرات کی ایک بےنظیر کتاب ہے۔ یہ کتاب اللہ کے پیغمبروں اور ان کی اقوام کے درمیان مذاکرات پر مشتمل ہے جیسا کہ ہمیں اس کی متعدد سورتوں میں نظر آتا ہے کہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت ہو، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام اور دیگر انبیاء کرام نے اپنی اپنی اقوام سے مذاکرات کئے۔

اس کتاب میں اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کے درمیان ہونے والے مذاکرات کا بھی بیان ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو اس نے ملائکہ سے مذاکرات کئے بلکہ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی بدترین مخلوق ابلیس سے بھی گفتگو کی۔ یہ ایک طویل گفتگو ہے جس کی تفصیلات قرآن کریم کی متعدد سورتوں جیسے سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ اسراء اور سورۂ ص میں موجود ہیں۔

اس لئے ہم خود سے اختلاف رائے رکھنے والے ہر شخص کے ساتھ مثبت اور تعمیری مذاکرات کا خیر مقدم کرتے ہیں بشرطیکہ اس کا مقصد

تلاش حقیقت ہو نہ کہ ہمارے اوپر مخصوص تصورات یا کوئی خاص نظریہ یا کوئی متعین پالیسی تھوپنا۔ ہم خاص طور پر اہل کتاب سے اور ان میں بھی خصوصی اہمیت کے ساتھ نصاریٰ سے مذاکرات چاہتے ہیں۔

قرآن نے ہمیں درج ذیل آیات میں مذاکرات کا طریقہ سکھایا ہے: "**ولا تجادلوا أهل الكتاب إلا بالتي هي أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذي أنزل إلينا و أنزل إليكم و إلهنا و إلهكم واحد ونحن له مسلمون**" (العنکبوت: ۲۹/۴۶)۔ (اور تم اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے مگر جو ان میں سے بے انصاف ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس پر جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے۔ ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اس کی فرماں برداری کرنے والے ہیں)۔

ہمیں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے مناسب اور احسن طریق پر مذاکرات کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مستثنیٰ ان میں سے صرف وہ لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ ظلم کا رویہ اختیار کریں اور اپنے حدود سے تجاوز کریں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کسی طرح کے مذاکرات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے علاوہ جہاں تک دوسرے اہل کتاب کا تعلق ہے تو ہم ان سے نرم لہجہ اور اچھے انداز میں مذاکرات کریں گے۔ اسی طرح ان سے مذاکرات میں مشترک پہلوؤں اور متفق علیہ نکات کا ذکر کیا جانا چاہئے نہ کہ متنازعہ اور اختلافی نکات۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "**وقولوا آمنا بالذي أنزل إلينا و أنزل إليكم و إلهنا و إلهكم واحد و نحن له مسلمون**" (العنکبوت: ۲۹/۴۶)، (اور کہو ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس پر جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے۔ ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں)۔

چنانچہ قرآن نے اتفاقی نکات ذکر کئے ہیں تاکہ مذاکرات کے دونوں فریقوں کو باہم قریب کیا جاسکے۔

چونکہ صہیونی یہودیوں نے ہم پر مظالم ڈھائے ہیں، ہماری زمین غصب کی ہے، ہمارے لوگوں کو گھر سے بے گھر کیا ہے اور ہمارا خون بہایا ہے اس لئے ان سے تو اب صرف ہماری جنگ ہی ہوگی مگر ہم ان دوسرے یہودیوں سے مذاکرات کریں گے جو قبضہ کے جرم میں ملوث نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اہل کتاب میں سے عیائی حضرات سے عمدہ طریقہ پر مذاکرات کریں گے اور ہم اخلاص کے ساتھ نہ کہ عناد کے ساتھ، ان کے لئے اپنے دل کھول دیں گے، کیونکہ ہمارا ایمان مفاہمت کی ضرورت پر ہے نہ کہ تصادم کے لازم ہونے پر۔

عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام کے صدر ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے "اتحاد" کی تاسیسی نشست سے خطاب کرتے ہوئے اپنے افتتاحی خطبہ میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:

ہم کھل کر اس بات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام اپنے آپ میں محدود اور سمٹا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کے دروازے اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی پوری دنیا کے مذاہب، نظریات اور تہذیبوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ "اتحاد" اپنے خالص دینی نقطۂ نظر کی روشنی میں نسلی، لسانی، مذہبی اور ثقافتی تکثیریت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ وحدت صرف اللہ کی ذات کے ساتھ خاص ہے، اس کے علاوہ سب میں تعدد اور اشتراک ہے۔ یہ تعدد و اشتراک اللہ تعالیٰ کی حکمت سے مربوط اس کی مشیت کی بنا پر ہے "اتحاد" کا اعتقاد ہے کہ اختلاف رائے رکھنے والوں کے درمیان مذاکرات ضروری ہیں۔ ان کے درمیان کش مکش لازم ہو، ایسا نہیں ہے۔ "اتحاد" یہ سمجھتا ہے کہ اگر مقاصد درست ہوں، نیتیں صاف ہوں، عزائم پختہ ہوں اور آداب ملحوظ رکھے جائیں جیسا کہ "احسن طریقہ پر مذاکرات" کے حوالہ سے قرآن کی ہدایت موجود ہے، تو مذاکرات ضرور ثمر آور نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں۔

اسی لئے ہم مسلمان اور مسیحی برادران کے درمیان مذاکرات کا خیر مقدم کرتے ہیں، کیونکہ قرآن اور اہل اسلام کے نزدیک حضرت مسیح، ان کی والدہ اور انجیل کا ایک خاص مقام ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ درج ذیل اہم میدانوں میں دونوں فریق ایک دوسرے کا بہتر تعاون کر سکتے ہیں:

١- اول: اللہ اور یوم آخرت پر ایمان:

موجودہ دور کی بے لگام مادہ پرستی سے مقابلہ کے لئے اس پر توجہ نہایت ضروری ہے، کیونکہ اس وقت کی مادیت ''غیب'' اور ماورائے محسوسات کی منکر ہے۔ یہ پوری دنیا میں لادینیت کو فروغ دے رہی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زندگی کا قصہ صرف اتنا ہے کہ رشتے ناطے یہیں ٹوٹ جاتے ہیں اور زمین سب کو نگل جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی مرحلہ ہے ہی نہیں: ''**نموت ونحيا وما يهلكنا إلا الدهر**'' (الجاثیۃ: ٤٥/ ٢٤)، (ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہم کو صرف زمانہ کی گرش ہلاک کرتی ہے)۔

اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اس لئے بھی ضروری ہے تا کہ ان گروہوں کا رد کیا جا سکے جو اللہ پر محض نظری ایمان رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اور اپنے نظام فکر میں اس کو کوئی جگہ نہیں دیتے۔ اسی طرح وہ اسے حکم دینے یا منع کرنے کا اختیار دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ یہ ایک بے مصرف کا ایمان ہے جس کا کوئی کردار نہیں۔

دوم: اخلاقی اقدار:

حق کی رہنما نبوتوں سے انسانیت کو ورثہ میں ملی اعلیٰ انسانی اقدار کو بہالے جانے والے اباحثیت پسندی اور بے لگام آزادی کے سیلاب کے آگے بند باندھنے کے اخلاقی اقدار کی پابندی ضروری ہے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسیحی مغرب میں یا یوں کہہ لیجئے کہ مسیحی مان کئے گئے مغرب میں عریانیت، جنسی بے راہ روی، زنا بالرضا، ہم جنسی کی شادی اور علی الاطلاق اسقاط حمل کو جائز قرار دیا جا چکا ہے۔

سوم: انصاف، وقار اور آزادی:

اس کے ذیل میں اقوام کی خودمختاری، اپنے چھینے ہوئے حقوق، اپنی سلب کی گئی آزادی اور اپنی چھینی ہوئی زمین واپس لینے کا اختیار سب کے سب آتے ہیں۔ ان حقوق کی پامالی کی ایک نمایاں مثال مظلوم فلسطینی قوم ہے جس کا خون ہر روز بہایا جا رہا ہے، جس کے گھر ڈھائے جا رہے ہیں، جس کی کھیتیاں جلائی جا رہی ہیں، جس کے درخت کاٹے جا رہے ہیں، جس کی زمین چھینی جا رہی ہے، جس کی حرمتیں پامال کی جا رہی ہیں اور جس کے مقدسات کو مہذب دنیا کی نظر کے سامنے روندا جا رہا ہے۔

یہ وہ شعبے ہیں جن میں اللہ اور اس کے رسولوں اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ایمان مخالف اور اہل ایمان سے برسر پیکار لوگوں کے خلاف باہم تعاون کر سکتے ہیں۔

اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات:

١- ہمارا ایمان ہے کہ غیر مسلموں سے تعلقات کی شرعی بنیاد کتاب اللہ کی درج ذیل دو آیات ہیں: ''**لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم و تقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين إنما ينهاكم الله**

عن الذين قاتلوكم فی الدين و أخرجوكم من دياركم وظاهرو علی إخراجهم أن تولوهم ومن يتولهم فأولئک هم الظالمون“ (الممتحنۃ:۶۰/۸-۹)۔(اللہ تم کو ان لوگوں سے نہیں روکتا جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے بھلائی کرو اور تم ان کے ساتھ انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ بس تمہیں ان لوگوں سے منع کرتا ہے جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو اور جو ان سے دوستی کرتے تو وہی لوگ ظالم ہیں)۔

دوسری آیت دوران جنگ میں غیر مسلموں سے تعلقات کا یہ اصول طے کرتی ہے کہ اس صورت حال میں ان دوستی اور تعاون جائز نہیں ہے۔ اس سے پہلے ہم ”اسلام اور جہاد“ کے باب کے تحت دوران جنگ میں غیر مسلموں سے تعلقات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ اس باب میں ہم بہ طور خاص ان بنیادوں کو زیر بحث لائیں گے جو حالت امن میں مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات کے احکام کا تعین کرتی ہیں۔ پہلی آیت ان احکام کا خلاصہ دو الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے: ایک ”برّ“ اور دوسرا ”قسط“۔ یہ ایک مسلمان سے تمام انسانوں کے حوالے سے مطلوب ہے خواہ وہ اس کے دین کا انکار ہی کیوں نہ کرتے ہوں، بشرطیکہ وہ اس سے آمادۂ جنگ نہ ہوں، اس کے مبلغین وسفراء کی مزاحمت نہ کریں اور اسلام کے ماننے والوں کو ظلم کا نشانہ نہ بنائیں۔ جہاں تک ان امن پسندوں کا تعلق ہے جو نہ مسلمانوں سے دین کے باب میں لڑیں، نہ انہیں ان کے گھر سے نکالیں اور نہ ان کو نکالنے میں ان کے دشمنوں کی مدد کریں تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے ساتھ ”برّ“ (حسن سلوک) اور ”قسط“ (انصاف) کا معاملہ کرنے سے نہیں روکا ہے، بلکہ فرمایا کہ وہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے جیسا کہ وہ نیک سلوک کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ”قسط“ سے مراد ہے: انصاف اور ”برّ“ سے مراد ہے: حسن سلوک۔ ”قسط“ یہ ہے کہ آپ حق دار کو اس کا حق دے دیں اور اس میں کمی نہ کریں جب کہ ”برّ“ یہ ہے کہ آپ از راہ ہمدردی اسے اس کے حق سے زیادہ دیں۔ ”قسط“ یہ ہے کہ آپ صرف اپنا حق لیں اور اس سے زیادہ نہ لیں جب کہ ”برّ“ یہ ہے کہ آپ اپنے حق کے ایک حصہ سے دست بردار ہو جائیں۔ یہاں ہمارے لئے غور وتدبر کا پہلو یہ ہے کہ قرآن کریم نے مخالفین کے سیاق میں لفظ ”برّ“ کا استعمال کیا ہے۔ اسلام کی سطح پر یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد سب سے مقدس حق کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یعنی والدین کے حق کے لئے، اسی لئے کہا جاتا ہے: ”برالوالدین“ (والدین کے ساتھ حسن سلوک)۔

۲- غیر مسلموں میں سے اہل کتاب کا اسلام کے قانون اور احکام میں ایک خاص مقام ہے۔ اسلام میں ”اہل کتاب“ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا دین بنیادی طور پر کسی آسمانی کتاب پر مبنی ہو جیسے یہود ونصاری جن کا دین توریت اور انجیل پر مبنی ہے۔

چنانچہ قرآن دین کے حوالہ سے ان سے مباحثہ کے لئے احسن طریقہ کی پابندی لازم قرار دیتا ہے تا کہ یہ مباحثہ سینوں کو مشتعل کرنے اور دلوں میں جنگ وجدل نیز عصبیت وبغض کی آگ بھڑکانے کا باعث نہ بنے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ولاتجادلوا أهل الكتاب إلا بالتی هی أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذی أنزل إلينا و أنزل إليكم و إلهنا و إلهكم واحد و نحن له مسلمون“ (العنکبوت:۲۹/۴۶)۔(اور تم اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے ان کو چھوڑ کر جو ان میں سے بے انصاف ہیں اور کہو ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس پر جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے۔ ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں)۔

قرآن کریم کی اس ہدایت کے باوجود کہ ازدواجی زندگی باہمی محبت وہمدردی پر قائم رہتی ہے: ”ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجاً لتسكنوا إليها و جعل بينكم مودةً و رحمة“ (الروم:۳۰/۲۱)، (اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس

نے تمہاری جنس سے تمہارے لئے جوڑے بیدا کئے تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی)۔

اسلام نے اہل کے ساتھ کھانا پینا، ان سے مصاہرت (داماد اور سسر کا رشتہ قائم کرنا) اور ان کی پاک باز اور باحیا خواتین سے نکاح کرنا جائز قرار دیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کے لئے یہ جائز قرار دیا ہے کہ اس کے گھر کی مالکن، اس کی زندگی کی شریک اور اس کی اولاد کی ماں ایک غیر مسلم خاتون ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ ایک مسلمان کی اولاد کے ماموں، اس کی خالائیں، اس کے ناناں اور اس کی نانیاں غیر مسلم ہوں: "**وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم وطعامكم حل لهم والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم إذا آتيتموهن أجورهن محصنين غير مسافحين ولامتخذي أخدان**" (المائدۃ:۵/۵)۔ (اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے اور حلال ہیں تمہارے لئے پاک دامن عورتیں مومنوں میں سے اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی جب تم انہیں ان کے مہر دے دو اس طرح کہ تم نکاح میں لانے والے ہو نہ اعلانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو)۔

یہی حکم تمام اہل کتاب کا ہے خواہ وہ اپنے ممالک میں ہوں یا دارالاسلام میں۔

اہل ذمہ:

اگر غیر مسلم دارالاسلام میں مسلمانوں کے ساتھ رہ رہے ہوں اور وہ وہاں کے اصل باشندے اور شہری ہوں تو وہ مسلمانوں کی طرف سے ایک دائمی ذمہ داری اور پناہ میں ہوتے ہیں۔ اس ذمہ داری کو "عقد الذمۃ" (تحفظ کا معاہدہ) کہا جاتا ہے۔ ذمہ کے معنی ہیں: ذمہ داری، ضمانت، پناہ، ان کو "اہل ذمہ" کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ انہیں اللہ، اللہ کے رسول اور مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے اس امر کی ضمانت حاصل ہے کہ وہ اسلام کی پناہ میں اور مسلم معاشرہ کے تحفظ میں سکون واطمینان کے ساتھ رہیں۔ یہ اپنے اور اہل اسلام کے مابین طے شدہ "تحفظ کے معاہدہ" کی بنا پر مسلمانوں کی پناہ اور ضمانت میں ہیں۔ پناہ اور تحفظ کا یہ معاہدہ ایک غیر مسلم شخص کو وہ حق عطا کرتا ہے جو موجودہ زمانہ میں حکومتوں کی طرف سے اپنے عوام کو دیئے جانے والے "سیاسی قومیت" کے حق کے مشابہ ہے۔ اس حق کے نتیجہ میں عوام کو شہریوں جیسے حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں اور ان کے جیسے فرائض بھی ان پر عائد ہوجاتے ہیں۔

لہٰذا اس بنیاد پر ایک "ذمی" مختلف اسلامی مکاتب فکر کی اصطلاح کے مطابق "دارالاسلام" کا باشندہ ہوجاتا ہے۔ "اہل دار" کی فقہی اصطلاح کو آج کی سیاسی اصطلاح کے مطابق "مواطنہ" (شہریت) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ "شہریت" مسلمانوں کے وضع کردہ "عقد ذمہ" (ضمانتی معاہدہ) ہی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔

آج کے زمانہ میں "ذمہ" کا لفظ بیش تر لوگوں کے درمیان رائج نہیں، کیونکہ لوگ اس کے حقیقی معنی سے ناواقف ہیں۔ اس لفظ کے غیر مقبول ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ کچھ غلط تاریخی واقعات جوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ "اہل ذمہ" کو دوسرے درجہ کا شہری سمجھتے ہیں۔ اب چونکہ "ذمہ" کا لفظ رائج نہیں ہے، اس لئے ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ اس کو موجودہ دور کی عوامی سطح پر مروج اصطلاح "شہریت" سے بدل دیا جائے۔ کیونکہ سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے "دارالاسلام" میں رہنے والوں کو تمام حقوق عطا کئے اور انہوں ہی نے اپنے ساتھ رہنے والے ان لوگوں کو بھی جو ان کے دین کو نہیں مانتے تھے اپنی بلکہ اللہ اور رسول کی پناہ اور ضمانت میں رکھا۔

عقد ذمہ اور شہریت کا تقابل:

جو شخص عقد ذمہ سے متعلق احکام کی تفصیلات پر گہرائی سے غور کرے گا اسے معلوم ہوگا کہ یہ اصطلاح اپنے بیش تر پہلوؤں کے اعتبار سے اصول شہریت سے مطابق رکھتی ہے۔

-عقد ذمہ ایک دائمی ضمانت ہے جو بچوں کو پیدائش کی بنیاد وراثت میں حاصل ہوتی ہے۔اس کی تجدید کی بھی ضرورت نہیں ہے۔یہی حال حق شہریت کا بھی ہغ۔

-مسلمانوں یا ان کے امیر کے لئے اس ضمانتی معاہدہ کو توڑنا جائز نہیں بلکہ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی پابندی ان پر لازم ہے۔ البتہ ذمی کے لئے اس معاہدہ کو ختم کرنا جائز ہے۔یہی حال شہریت کا ہے۔حکومت کسی کی شہریت نہیں چھین سکتی ہے البتہ خود شہری اپنی مرضی سے جب چاہے اس سے دست بردار ہوسکتا ہے۔

-اگر ایک شخص ذمہ کا معاہدہ توڑ ڈالے تو اس کا اثر اس کی بیوی پر اور اس کی اولاد پر خواہ وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہوں،نہیں پڑے گا بلکہ وہ بہ دستور" دارالاسلام" کے شہری بنے رہیں گے۔یہ حکم کسی دوسرے معاہدہ کا نہیں ہے۔یہ حکم بھی عقد ذمہ کو معاصر شہریت جیسا بنا دیتا ہے۔

-ضروری نہیں عقد ذمہ جنل یا ماتحت بنانے ہی کے نتیجہ میں تشکیل دیا جائے بلکہ یہ جمہور فقہاء کے بہ قول کسی مسلم ملک میں کم سے کم ایک سال کی مدت تک محض رہ لینے سے بھی تشکیل پایا جاتا ہے۔اگر دارالاسلام میں پناہ لینے والا غیر مسلم ایک سال سے زیادہ مدت تک دار الاسلام میں مقیم رہنا چاہے تو اسے اختیار ہوگا کہ چاہے تو دارالاسلام کی شہریت حاصل کر کے ذمی بن جائے یا چاہے تو اپنے ملک کی طرف واپس چلا جائے۔یہ صورت بھی متعینہ مدت تک کسی ملک میں رہنے کے حوالے سے موجودہ قوانین میں دیئے گئے حصول شہریت وقومیت کے حق کی طرح ہی ہے۔

-عہد ذمہ مسلمانوں کا امیر یا اس کا قائم مقام مسلمانوں کی طرف سے طے کرتا ہے،اس لئے یہ حکومت کی طرف سے دی جانے والی شہریت کی طرح ہے۔

-تمام لوگوں کے لئے جائز ہے کہ مسلمانوں کی پناہ میں آئیں خواہ ان کا مذہب کچھ بھی ہو بلکہ وہ لوگ بھی اس پناہ اور تحفظ کے حق دار ہوسکتے ہیں جو کسی مذہب کو نہ مانتے ہوں۔یہ معاہدہ اس وقت تک برقرار رہے گا جب تک کہ اس معاہدہ کا غیر مسلم فریق مسلمانوں کے ساتھ رہنے اور ان کے عوامی قوانین کو تسلیم کرنے پر راضی ہو۔یہی احناف کی رائے ہے اور مالکیہ نیز امام احمد سے بھی ایک روایت یہی ہے۔یہ حکم بھی موجودہ دنیا کے اس قانون جیسا ہی ہے جس کے تحت حکومتیں کسی بھی شخص کو اس کے مذہب اور عقیدہ سے قطع نظر،اپنے اپنے ممالک کی شہریت دیتی ہیں۔

-بنیادی طور پر اہل ذمہ کے حقوق بھی حقوق شہریت جیسے ہی ہیں۔ہمارے معروف دستور ہے:"انہیں غیر مسلموں کو) وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور ان پر بھی وہی فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں۔لہٰذا اپنے عقائد اپنی عبادات اور اپنے عائلی قوانین سے متعلق تمام حقوق انہیں حاصل ہوں گے۔وہ اپنی جان،اپنے مال اور اپنی عزت وآبرو کے حوالے سے حکومتی تحفظات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے حق دار ہوں گے۔مسلمانوں کی طرح انہیں بھی حق ہوگا کہ حکومت کی سرپرستی سے مستفیض ہوں۔اسی طرح وہ ملک کے عام قوانین اور عدلیہ کے عمومی اختیارات کے ماتحت ہوں گے۔انہیں حق ہوگا کہ اپنے آپ کو ہر قسم کے ظلم سے بچانے کے لئے عدلیہ کا سہارا لیں

یہاں تک کہ اس صورت میں بھی جب ان کا مدعا علیہ خود خلیفۂ وقت ہو، کیونکہ ایک ذمی کو بھی عدالت میں اپنا مقدمہ دائر کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ وہ مسلمانوں کے کسی فرد کو۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ موجودہ دور میں ''حق شہریت'' اپنے بنیادی پہلوؤں کے اعتبار سے ''عقد ذمہ'' کے مشابہ ہے۔ اس میں مزید شرعی ضوابط کی پابندی بھی شامل کی جاسکتی ہے۔ ہمیں اس نکتہ کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ فقہاء کی بیان کردہ بیش تر شرائط کا تعلق ان کے ان اجتہادات سے تھا جو انہوں نے مسلمانوں کے مصالح اور ان کے مقتضیات کو مدنظر رکھتے ہوئے کئے تھے اور اپنے اپنے دور میں ائمہ نے ان سے اتفاق کیا تھا۔ یہ ضروری نہیں کہ انہیں قیامت تک کے لئے لازمی احکام کا درجہ دیا جائے۔

غیر مسلم ملک میں رہنے والا مسلمان:

دیگر باشندوں ہی کی طرح اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ بنیادی بات تو یہی ہے کہ ان ممالک کو چاہئے کہ انسانی حقوق اور آزادیوں کے تحفظ کی تلقین کرنے والے رائج الوقت بین الاقوامی دساتیر و اعلانات کی روشنی میں وہ ان مسلمانوں کے مذہبی حقوق اور آزادیوں کا بھی تحفظ کریں اگرچہ سلامتی کونسل پر قابض دنیا کے بڑے بڑے ممالک جن میں امریکہ سب سے پیش پیش ہے، اپنے اپنے مفادات اور اغراض کے تحفظ کے لئے ان دساتیر کو نظر انداز کرنے میں مصروف ہیں۔

یہ مسئلہ کہ ایک مسلمان دارالاسلام کی حدود سے باہر جائے یا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرے، آج کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر اس طریقہ پر حل نہیں کیا جاسکتا جس طریقہ پر اسے سابقہ ادوار میں حل کیا گیا۔ یہ اصول اپنی جگہ کہ اصل چیز جواز ہے، اسی طرح یہ پہلو بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہی اباحت حالات اور نیتوں کے مطابق کسی مسلمان کے حق میں حرمت یا وجوب میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے مگر یہاں ہم ایک موجودہ صورت حال پر گفتگو کر رہے ہیں۔ آج دنیا کا کوئی ملک مسلمانوں سے خالی نہیں ہے اور غیر مسلم ممالک میں رہنے والے بیش تر مسلمان ان ملکوں کے اصل باشندے ہیں۔ لہٰذا اس موجود اور عملی صورت حال کا حل اسلام ہی سے تلاش کرنا ہوگا۔ موجودہ دور کی اقلیتوں پر گفتگو کرتے ہوئے ہجرت یا قومیت کے ان مسائل کو پیش نظر رکھنا جو سابقہ ادوار میں کچھ تاریخی اسباب وظروف کی وجہ سے زیر بحث لائے گئے تھے اور اب ان کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے، درست نہ ہوگا۔ یہ مسائل آج کے مسلمانوں کے حالات سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہیں، اس لئے ہمیں بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا:

- ایک مسلمان کے لئے شرعی اصول یہ ہے کہ وہ دنیا کے جس خطہ میں جس قوم کے ساتھ اور جس نظام حکومت کے تحت رہنا چاہے، رہ سکتا ہے بشرطیکہ اسے اپنے دینی فرائض کی ادائیگی اور ایک انسان نیز ایک شہری کی حیثیت سے اسے اپنے بنیادی حقوق اور آزادیوں سے فائدہ اٹھانے کے مواقع حاصل ہوں۔ ہمیں اس اصول کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کے اس انداز تخاطب سے ملتی ہے کہ اس نے قرآن کی سینکڑوں آیات میں انسان سے بحیثیت فرد یا جماعت خطاب کیا ہے۔ اس کا یہ خطاب انسان کے کسی خاص مقام اقامت یا رہائش کو سامنے رکھ کر نہیں ہے۔ یہ پہلو بھی کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جو تمام بندگان خدا کے لئے ہے، اس اصول کی تائید کرتا ہے۔ دور دراز قبائل سے تعلق رکھنے والے بیش تر صحابہ کرام جب اسلام قبول کرتے تو آپؐ انہیں اپنے قبائل میں لوٹ جانے کی ہدایت فرماتے، تاکہ بعد میں وہ آپؐ کے غلبہ کی خبر سننے کے بعد آپؐ سے آملیں۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمان مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہونے کے باوجود مدینہ واپس لوٹ

کر نہیں آئے اور سنہ ۷ ۵۰ ھ میں غزوۂ خیبر تک حبشہ ہی میں مقیم رہے۔ سیرت کی کتابوں میں کہیں یہ تذکرہ نہیں ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے انہیں یہ کہہ کر کہ کفار کے ساتھ رہنا جائز نہیں، اپنے پاس آنے کا حکم دیا ہو۔

ایک غیر مسلم معاشرہ میں رہنے والے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ وہاں کے لوگوں کے ساتھ حالت ام کی اخلاقیات کی روشنی میں معاملہ کرے نہ کہ حالت جنگ کے اصول واحکام کے تحت۔ اسے اس معاہدہ شہریت یا اقامتی دستاویز کی لازماً پابندی کرنی ہوگی جس کی بنیاد پر اسے اس خطۂ زمین کے باشندوں کے ساتھ رہنے اور ان کے منتخب کردہ نظام حکومت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ایک مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے وطنی فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ احکام شریعت کے حدود میں اپنے حقوق کا مطالبہ کرے۔ اس کا فرض ہے کہ معاشرہ کا ایک مثبت عنصر بن کر رہے، معروف کی تلقین کرے، منکر سے روکے، لوگوں کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کرے، ہر جائز عمل میں شریک ہو، دوسروں کے ساتھ ہر اختلافی مسئلہ میں مذاکرات کا طریقہ اختیار کرے اور اللہ کی رضا کے کاموں میں لوگوں کے ساتھ تعاون کرے۔ اسی کے ساتھ اس پر لازم ہے کہ اس کے اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق جو کام غلط اور گناہ ہے اس میں شرکت سے پرہیز کرے۔ لوگوں تک صرف اسلام کی نظری دعوت ہی پہنچا دینا کافی نہیں ہے، اسے اپنے معاشرہ کی اصلاح، معاشرہ میں انصاف، رواداری، اور افہام وتفہیم کی فضا کو فروغ دینے اور دنیا کے بیش تر ممالک میں تیزی سے پھیلتی جارہی حیوانی مادہ پرستی پر جو انسان کے مقصد زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن چکی ہے، انسانی اقدار کو غالب کرنے کا عزم لے کر سماجی اور سیاسی زندگی میں لوگوں کے ساتھ شریک ہونا ہوگا۔

سماج کے تمام افراد کو ساتھ لیکر سماج کو متحد کرنے اور سب کو درپیش خطرات ومسائل سے نمٹنے میں ایک دوسرے کے تعاون کے لازمی ہونے پر آپؐ کی درج ذیل حدیث سب سے زیادہ زور دیتی ہے:

''کچھ لوگ ایک کشتی میں اپنی نشستوں کے لئے قرعہ اندازی کریں، کچھ کو بالائی حصہ میں جگہ ملے اور کچھ کو زیریں حصہ میں۔ زیریں حصہ والوں کو جب پانی کی ضرورت ہو تو وہ بالائی حصہ والوں کے پاس سے ہو کر گزرنے پر مجبور ہوں، اب اگر زیریں حصہ والے یہ کہیں کہ ہمیں کشتی کے اپنے والے حصہ میں چھید کر لینا چاہئے تاکہ ہمارے اوپر والوں کو تکلیف نہ ہو تو اگر بالائی حصہ والے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کو اپنے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو سب کے سب ہلاک ہوجائیں گے اور اگر وہ ان کا ہاتھ پکڑ لیں تو سب کے سب بچ جائیں گے'' (صحیح البخاری، کتاب الشرکۃ، باب ہل یقرع فی القسمۃ، حدیث نمبر: (۲۳۶۱) بہ روایت حضرت نعمان بن بشیر، سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب منہ، حدیث نمبر: (۲۰۹۹) بہ روایت حضرت نعمان بن بشیر)۔

اسلام اور مغرب:

اسلام ایک عالمی پیغام ہے۔ وہ مشرق اور مغرب کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں دونوں اللہ تعالیٰ کی وسیع زمین کا ایک حصہ ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ولله المشرق والمغرب فأينما تولوا فثم وجه الله إن الله واسع عليم'' (البقرہ: ۲/ ۱۱۵)، (اور مشرق ومغرب اللہ ہی کے لئے ہے۔ تم جدھر رخ کرو اسی طرف اللہ ہے۔ یقیناً اللہ وسعت والا ہے علم والا ہے)۔

اہل مغرب بھی اسی عالمین (کائنات) کا ایک جزء ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمدؐ کو رحمت بنا کر بھیجا جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: ''وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين'' (الأنبياء: ۲۱/ ۱۰۷)، (اور ہم نے تم کو بس دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

مسئلہ کی اہل مغرب کے ہاں بلکہ اگر احتیاط سے کام لیتے ہوئے کہا جائے تو ان میں سے بیش تر کے دلوں میں ہے۔اس کی ایک مثال اسلام کے حوالے سے ان کا وہ موقف ہے اس کے تحت انہوں نے اپنے ذہنوں میں اسلام کی ایک ایسی تصویر تخلیق کر لی ہے جس کا حقیقی اسلام سے دور یا قریب کا کوئی تعلق نہیں۔

اسلام کی یہ شبیہ ان کو صلیبی جنگوں سے ورثہ میں ملی ہے جب یوروپ سے آنے والی ان کی افواج مسلسل حملے کر کے طوائف الملوکی سے دو چار خطۂ اسلام کے ممالک کو تاراج کر رہی تھیں اور وہاں اپنی ماتحت حکومتیں اور سلطنتیں قائم کر رہی تھیں۔شروع شروع میں تو انہیں کامیابی ملی مگر جلد ہی انہیں حطین کے معرکوں، بیت المقدس کی فتح اور منصوبوں کے میدان جنگ میں شکست فاش سے دو چار ہونا پڑا اور ''لویس نہم'' دار ابن لقمان میں گرفتار کر لیا گیا۔

ان جنگوں کے ذہنی اور نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے جو مغرب کی نشأۃ ثانیہ کی وجہ بنے۔یہ نشأۃ ثانیہ دراصل اس استفادہ کا نتیجہ تھی جو مغرب نے مشرق کی اسلامی تہذیب سے کیا۔مگر اہل مذہب نے اپنے عوام کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی ایسی نفرت انگیز اور ناپسندیدہ تصویر پیش کی جس کا اسلام اور امت مسلمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے باوجود اسلام کی یہی تصویر مغربی دماغوں اور مغربی نفسیات میں راسخ ہے اور یہی تصویر ان کے ہاں نسلاً بعد نسل منتقل بھی ہوتی رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو جن کا ہم نے تذکرہ کیا، دیکھیں گے کہ جب وہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام پر گفتگو کریں گے تو بڑی معروضیت اور انصاف کا مظاہرہ کریں گے،مگر جب وہ اسلام، اسلامی تہذیب اور امت مسلمہ کو موضوع گفتگو بنائیں گے تو ایک ایسا موقف اختیار کریں گے جو نفسانیت کے ساتھ ساتھ حد درجہ عصبیت اور جانب داری پر بھی مبنی ہوگا، حالانکہ انصاف کے خواہاں محقق کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ موروثی بندھنوں سے آزاد ہو اور ایک ایسا اسلوب اختیار کرے جس میں انا پر معروضیت کو اور عصبیت پر حق کو ترجیح حاصل ہو۔یوروپی اہل قلم کے اس تعصب کا اعتراف گوشاف لوبون اور منٹگمری واٹ جیسے مغربی مصنفین اور مؤرخین نے کیا ہے۔

مغرب کے حوالے سے ہمارا موقف:

جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہم مغرب سے کھلنا چاہتے ہیں۔ہم اپنے دین میں اس کی ترغیب پاتے ہیں، ہم نہیں چاہتے کہ اپنے خول میں بند رہیں یا دوسروں سے دشمنی رکھیں۔ہمارا یہ موقف درج ذیل وجوہ کی بنا پر ہے:

اول: ہم ایک عالمی پیغام کے حامل ہیں جو روئے زمین کے ہر شخص کے لئے آیا ہے۔یہ بات درست ہے کہ اسلام کا آخری صحیفہ عربی میں ہے، پیغمبر اسلام بھی عرب ہیں اور اسلام کی نشو ونما مشرق میں ہوئی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام کسی خاص نسل یا کسی مخصوص خطہ کے لئے ہے۔وہ تو روئے زمین کے تمام لوگوں کے لئے ہے۔

مسیحیت مشرق میں پروان چڑھی مگر پوری دنیا میں پھیلی۔

دوم: اتحاد، یک جہتی اور مفاہمت کے پہلو زیادہ ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''**یـأیهـا النـاس إنا خلقنـاكم من ذكر و أنثى و جعلناكم شعوباً و قبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم إن الـلـه عـليـم خبير**'' (الحجرات:۴۹/۱۳)،(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم

کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے)۔

لہٰذا باہم متعارف ہونا نہ کہ ایک دوسرے سے نامانوس ہونا روئے زمین کی تمام اقوام کی ذمہ داری ہے۔

ہم اس یوروپی ادیب سے اتفاق نہیں کرتے جو یہ کہتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے اور یہ دونوں کبھی متحد نہیں ہو سکتے، کیونکہ اتحاد ممکن ہے بلکہ اگر نفسانیت پر عقل کو اور تعصب پر حکمت کو غالب رکھا جائے تو لازم ہے۔

سوم: آج دنیا بہت نزدیک آ چکی ہے خصوصاً مواصلاتی اور الکٹرانک انقلاب کے بعد یہاں تک کہ بعض اہل قلم نے کہا کہ دنیا ہمارے لئے ایک بڑا گاؤں بن گئی ہے، ہم کہتے ہیں کہ دنیا بڑا نہیں، ایک چھوٹا گاؤں بن چکی ہے۔ دنیا ایک بڑا گاؤں اس وقت تھی جب اس کے مشرق میں رہنے والوں کو مغرب میں پیش آنے والے واقعات کا علم ایک دن یا دو دن یا کم از کم واقعہ ہونے کے چند گھنٹوں بعد ہوتا تھا۔ جہاں تک آج کی دنیا کی بات ہے تو اب لوگوں کو کسی بھی جگہ ہونے والے واقعات کا علم چند سکنڈ بعد ہی ہو جاتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو لوگ واقعات کو ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

اس صورت حال کا تقاضہ ہے کہ آسمانی پیغامات کے حاملین لازماً باہم مذاکرات کریں اور مختلف تہذیبوں کے علم بردار مفاہمت کا راستہ اختیار کریں...... مذاکرات اور مفاہمت تنازعات اور نفرت سے بہتر ہیں۔ ہم بہ حیثیت مسلمان جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، قرآنی تصریحات کی بنیاد پر اس بات کے مکلّف ہیں کہ اپنے سے اختلاف رکھنے والوں اور بہ طور خاص اہل کتاب کے ساتھ احسن طریق پر مذاکرات کریں۔

ہم مغرب سے کیا چاہتے ہیں؟

ہم مغرب سے جو کچھ چاہتے ہیں اس کا خلاصہ درج ذیل الفاظ میں یہ ہے: مغرب قدیم عداوت کو ترک کر دے، کیونکہ ہم اس دور کی نسل ہیں ماضی کی باقیات نہیں۔

مغرب ہمارے ممالک اور ہمارے وسائل پر قبضہ کی خواہش اور نئے حریصانہ جذبات سے آزاد ہو جائے، کیونکہ سامراج کا دور پیچھے جا چکا۔ مغرب عالمی اور انسانی نقطۂ نظر کا حامل بنے اور بالادست رہنے کا خیال ترک کر دے جو رومیوں کا تھا اور جس کی بنا پر وہ اپنے علاوہ سب کو وحشی تصور کرتے تھے۔

مغرب اپنے اندر سے ہمارا ڈر نکال دے بہ طور خاص جب کہ ہم صدیوں سے مغرب کے ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔

مغرب قوت یا مکر و فریب کے ذریعہ ہم پر اپنا نظریہ اور اپنی منطق تھوپنے یا ہمارے اندرونی معاملات میں مداخلت سے باز آ جائے۔ ہم اپنے ممالک میں آزاد ہیں۔ ہم اپنی زندگی کی تنظیم اپنے عقیدہ، اپنے مصالح اور اپنی اقوام کے آزادانہ فیصلہ سے کریں گے۔

مغرب کے لئے اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ ہمیں سوویت یونین کے زوال کے بعد اپنا دشمن قرار دے کر اپنی اقوام کے جذبات کو ہمارے خلاف بھڑکائے۔ اسے اس کا کوئی حق نہیں کہ ہمیں ''سرخ خطرہ'' کے بعد 'سبز خطرہ'' کا نام دے اور ہمیں ''زرد خطرہ'' سے قریب بتائے۔

اسلام اگر خطرہ ہے تو صرف اباحیت پسندی، لادینیت، ظلم، آمریت، رذائل اور مفاسد کے لئے ان سے ہٹ کر باقی تمام امور میں وہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے عالم کے لئے ایک رحمت ہے اور مسلمان سارے عالم کے لئے خیر، محبت اور امن کے سفیر ہیں۔

اگر مسلمانوں میں کچھ ایسے افراد یا کچھ ایسے مخصوص طبقات پائے جاتے ہیں جو تشدد کا نامناسب استعمال کرتے ہیں تو یہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ یہ چھوٹے چھوٹے گروہ ہیں جن کو خود مغربی میڈیا نے بڑا بنا دیا ہے۔ ان میں سے بیشتر کو مسلمانوں کے خلاف مغرب کے مظالم، اس کی دشمنانہ پالیسیوں، کے تعصب، اس کی طرف سے ان کے ملک کو غصب کرنے اور ان کے لوگوں کو گھر سے بے گھر کرنے والے اسرائیل کی حمایت نے انتہا پسندی پر مجبور کیا ہے۔

ہم مسلمانوں کو جب کبھی کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جو ہمارے ساتھ انصاف کرتا ہے اور ہمیں تعصب سے پاک نظر سے دیکھتا ہے تو ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور ہمارے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ہم جب کبھی اسی فضا پاتے ہیں تو اس کی تحسین کرتے ہیں ایسی فضا پیدا کرنے والوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے لئے اپنے دل اور اپنے گھروں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔

اسلام اور گلوبلائزیشن:

بہت سے لوگ گلوبلائزیشن کے متعلق سوال کرتے ہیں اور اس حوالے سے ہمارا موقف جاننا چاہتے ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گلوبلائزیشن کا مطلب یہ ہے کہ مختلف اقوام، مختلف ممالک اور مختلف تہذیبوں کے درمیان رکاوٹیں اور دوریاں ختم ہوں تاکہ سب کے سب ایک دوسرے سے قریب ہو کر ایک ''عالمی تہذیب''، ''ایک عالمی بازار'' اور ''ایک عالمی خاندان'' میں تبدیل ہو جائیں۔ اسی لئے بعض لوگوں نے گلوبلائزیشن کی تعریف یہ کی ہے کہ یہ پوری دنیا کو ایک ''عالمی گاؤں'' میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔

گلوبلائزیشن ظاہر میں عالم گیریت کے اس تصور سے قریب ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے اور جس پر قرآن نے درج ذیل آیات میں زور دیا ہے: **''وما أرسلناک إلا رحمة للعالمین''** (الأنبیاء: ۲۱/ ۱۰۷)، (اور ہم نے تو بھی تم کو دنیا والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

''علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا'' (الفرقان: ۲۵/ ۱)، (بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان اتارا تاکہ وہ جہاں والوں کے لئے ڈرانے والا ہو)۔

''إن ھو إلا ذکر للعالمین ولتعلمن نبأہ بعد حین'' (ص: ۳۸/ ۸۷-۸۸)، (یہ تو بس ایک نصیحت ہے دنیا والوں کے لئے اور تم جلد اس کی دی ہوئی خبر کو جان لوگے)۔

مگر فی الواقع اسلام کی پیش کردہ عالم گیریت اور عام طور پر مغرب کی طرف سے اور خاص طور پر امریکہ کی طرف سے چلائی جا رہی گلوبلائزیشن کی تحریک کی حقیقت میں بڑا فرق ہے۔

اسلام کی پیش کردہ عالم گیریت تمام اولاد آدم کے اعزاز و اکرام کی بنیاد پر مبنی ہے: **''ولقد کرمنا بنی آدم''** (الإسراء: ۱۷/ ۷۰)۔ (اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی)۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے اور زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو ان کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اسی طرح اسلام کی عالمگیریت اس اصول پر قائم ہے کہ تمام لوگ انسانی شرف، احکام کا مکلّف ہونے اور ذمہ داریوں کا اہل ہونے میں برابر ہیں نیز

یہ کہ اللہ کے بندے اور آدم کے بیٹے ہونے میں سب شریک ہیں جیسا کہ اللہ کے رسولؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر موجود صحابہ کرام کے عظیم مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اے لوگو! سن لو! تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے۔ سنو! کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی سرخ کو کسی سیاہ پر اور کسی سیاہ کو کسی سرخ پر کوئی برتری حاصل نہیں ہے، البتہ اگر برتری کی کوئی بنیاد ہے تو وہ تقویٰ ہے' (مسند الامام احمد، مسند الانصار، باب حدیث رجل من أصحاب النبیؐ، حدیث نمبر: (۲۲۳۹۱)، اس حدیث کی روایت میں امام احمد منفرد ہیں۔ اس کی سند میں ایک راوی مبہم ہے۔ یہ حدیث حضرت ابونضرہ سے مرفوعاً مروی ہے)۔

اس طرح اللہ کے رسولؐ نے لوگوں سے اپنے خطاب میں قرآن کی درج ذیل آیت کی توثیق و تائید فرمادی: ''یا أیہا الناس إنا خلقنا کم من ذکر وأنثی وجعلنا کم شعوباً وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم إن اللہ علیم خبیر'' (الحجرات: ۴۹/۱۳)، (اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے)۔

قرآن کریم کی یہ آیت انسانوں کے درمیان عمومی مساوات کا اصول تو پیش کرتی ہے مگر اقوام کی خصوصیات کو کالعدم قرار نہیں دیتی ہے۔ قرآن اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے مختلف قبائل اور گروہ بنائے تا کہ وہ ایک دوسرے کو جان سکیں، ایک دوسرے سے ناواقف نہ رہیں۔

جہاں تک گلوبلائزیشن کا تعلق ہے تو اس تحریک کے اب تک کے تمام اقدامات سے ہم نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ پوری دنیا، خاص طور پر مشرق اور تیسری دنیا اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ عالم اسلام پر امریکہ کی طرف سے اپنی سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور سماجی بالادستی مسلط کرنے کی ایک کوشش ہے۔ امریکہ اپنی سائنسی اور تکنیکی برتری، اپنی زبردست عسکری قوت، اپنے اقتصادی وسائل اور اپنے تسلط پسندانہ نظریہ کی بنا پر خود کو پوری دنیا کا آقا تصور کرتا ہے۔

گلوبلائزیشن ایک مسئلہ کے دو فریق کو دو بھائی قرار نہیں دیتا، جیسا کہ اسلام کا موقف ہے، وہ فریقین میں سے ہر ایک کو برابر کی سطح پر بھی رکھ کر نہیں دیکھتا جیسا کہ پوری دنیا کے آزادی پسند اور شرفاء کا نقطۂ نظر ہے، بلکہ وہ دونوں کے درمیان آقا اور غلام، چھوٹے اور بڑے، برتر اور کم تر کا تعلق مانتا ہے۔

آج گلوبلائزیشن اپنی واضح ترین شکل میں پوری دنیا کو ''مغرب زدہ بنانے'' یا ''امریکہ'' کے رنگ میں رنگنے'' کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک جدید قسم کے سامراج کا مہذب نام ہے جس نے اپنا قدیم چولا اتار دیا ہے اور اپنے فرسودہ طریقے چھوڑ دیئے ہیں تا کہ گلوبلائزیشن کے پُرفریب نعرہ کے ذریعہ جبر و تسلط کے ایک نئے دور کا آغاز کر سکے۔ اس کا مطلب پوری دنیا پر امریکی اقتدار تھوپنا ہے اور اگر کوئی حکومت اس سے بغاوت کرے گی یا اس کا حکم ماننے سے انکار کرے گی تو اسے معاشی پابندیوں کے ذریعہ یا فوجی دھمکی سے یا براہ راست اس پر حملہ کر کے سبق سکھایا جائے گا جیسا کہ افغانستان، عراق، سوڈان، ایران اور لیبیا میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح اس کا مقصد یہ ہے کہ امریکہ ان بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ جن میں اسے بڑی حد تک فیصلہ کن اثر و رسوخ حاصل ہے، جیسے عالمی بینک، آئی ایم ایف، عالمی ادارۂ تجارت وغیرہ، اپنی اقتصادی پالیسیاں دوسروں پر تھوپے۔

اسی طرح امریکہ اس تحریک کے ذریعہ اباحیت پسندی کی حد تک آزادی کو جائز قرار دینے والے خود غرضانہ اور مادہ پرستانہ نظریہ پر مبنی اپنی مخصوص ثقافت پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے بین الاقوامی کانفرنسوں کے ذریعہ قانونی حیثیت دلوانے کے لئے اقوام متحدہ

کے وسائل کا استعمال کر رہا ہے اور دنیا کی تمام اقوام کو ڈرا دھمکا کر یا پُر فریب وعدوں کے ذریعہ لبھا کر اس کو تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

اس کا یہ مقصد ۱۹۹۴ء میں قاہرہ میں منعقد ہونے والی آبادی کانفرنس میں کھل کر سامنے آچکا ہے۔ اس کانفرنس میں ایسی دستاویز کو منظوری دینے کی کوشش کی گئی تھی جس کی رو سے علی الاطلاق اسقاط حمل، ایک صنفی خاندان (مردوں کی مردوں سے اور عورتوں کی عورتوں سے شادی) قانوناً جائز ہو۔ یہ اور اس طرح بہت سے ایسے امور اس کانفرنس کے ایجنڈے میں شامل تھے جو ایک طرف تمام آسمانی مذاہب کی تعلیمات سے متصادم ہیں اور دوسری طرف ہماری سماجی روایات اور ہمارے تہذیبی اور روحانی نظام کے منافی ہیں۔

اسی وجہ سے ہم نے دیکھا کہ مصر کے از ہر شریف، مکہ مکرمہ کی تنظیم رابطہ عالم اسلامی، اسلامی جمہوریہ ایران، متعدد اسلامی تحریکات اور تنظیمیں اس تباہ کن رجحان کو روکنے کے لئے ویٹیکن اور ارباب کلیسا کے شانہ بشانہ اٹھ کھڑی ہوئی، کیونکہ سب کو یہ احساس ہو گیا کہ انہیں ایک ایسے خطرہ کا سامنا ہے جس کی زد توحید، رسالت پر مبنی ان تمام اقدار و اخلاقیات پر پڑے گی جو انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصود ہیں۔

گلوبلائزیشن کا یہ رُخ ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں منعقد ہونے والی ''خواتین کانفرنس'' میں واضح ہوا۔ بعد کی تمام کانفرنسیں دراصل قاہرہ کانفرنس کا تسلسل، اس کے مقاصد کی حمایت اور اس کے نظریات تائید و تکمیل تھیں یہ مسئلہ کہ دوسروں کے امتیازی خصائص کو تسلیم کیا جائے نہایت اہم ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں اور جبراً کسی کے تشخص کو مٹانے کی کوشش نہ کریں۔

آج جس طرح گلوبلائزیشن کو پیش کیا جا رہا ہے، اس سے تو کمزور ممالک کے خلاف طاقتور ممالک کے، غریب ممالک کے خلاف امیر ممالک کے اور بدحال جنوب کے خلاف خوش حال شمال کے مفادات ہی کا تحفظ ہوگا۔

گلوبلائزیشن کے نام پر تجارت، اقتصادیات درآمدات و برآمدات، ثقافت اور میڈیا سمیت تمام شعبوں کے دروازے کھول دینے سے فائدہ صرف بڑی طاقتوں اور ان ممالک کو حاصل ہوگا جو سائنس، طاقتور میڈیا اور اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ ٹکنالوجی کے مالک ہیں بہ طور خاص وسائل کے اعتبار سے سب سے مستحکم، قوت کے اعتبار سے سب سے مضبوط، اثر ورسوخ کے اعتبار سے سب سے وسیع، سرمایہ کے اعتبار سے سب سے بڑے اور معلومات کے میدان میں سب پر فائق ملک کو جو صرف اور صرف امریکہ ہے۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن کو لوگ تیسری دنیا کہتے ہیں اور بہ طور خاص مسلم ممالک تو اس بین الاقوامی ڈور میں انہیں کچھ حاصل ہونے والا نہیں انہیں تو طاقتور ممالک کے پس خوردوں ہی پر انحصار کرنا ہوگا بشرطیکہ ان طاقتور ممالک کے پاس اتنا بچ بھی سکے کہ وہ دوسروں کو استعمال شدہ حصہ ہی دینے میں فیاضی برتیں۔

☆☆☆

خاتمہ

یہ ہے اسلام کے پیغام اور اس کے اہم مسائل کے حوالے سے عالمی اتحاد برائے علمائے اہل اسلام کا جامع، ہمہ گیر، اعتدال پسندانہ اور عملی موقف، اتحاد عقیدہ، شریعت، عبادات، معاملات، اخلاق، اقدار، دین، دنیا تہذیب، ثقافت، امت اور ریاست سمیت پورے کے پورے اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی یہ دعوت ان اصولوں کی روشنی میں ہے جن پر اس کا ایمان ہے۔ اتحاد حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ اتحاد بحث ومباحثہ میں احسن طریق کا پابند ہے۔

ہم ان ہی بنیادی اصولوں کی دعوت تمام ممالک کے رہنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف نظریات کے حامل مسلمانوں کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ ہم انہیں ان اصولوں کی تلقین کرتے ہیں اور ان کے دل ودماغ میں انہیں راسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ بچہ ان خطوط پر پروان چڑھے اور بڑ۔ ان اصولوں پر زندگی گزارتے گزارتے بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے۔

ان ہی اصولوں کی دعوت ہم غیر مسلموں کو بھی دیتے ہیں تا کہ وہ اسلام کو اس کی حقیقت کے ساتھ ان ثقہ اور اہلیت کے حامل علماء کے ذریعہ جان سکیں جن سے حجت قائم ہوتی ہے۔ ہمارا پیغام سب کے لئے یہی ہے: ''تعالوا إلی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ألا نعبد إلا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون اللہ فإن تولوا فقولوا اشہدوا بأنا مسلمون'' (آل عمران: ۳/ ۶۴)، (آ ؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے پھر اگر وہ اعتراض کریں تو کہہ دو کہ تم گواہ رہو ہم فرماں بردار ہیں)۔

''یا أیہا الناس إنا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند اللہ أتقاکم إن اللہ علیم خبیر'' (الحجرات: ۴۹/ ۱۳)۔ (اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے)۔

☆☆☆

فہرست

مقدمہ اشاعت سوم
مقدمہ اشاعت اول
امت مسلمہ: تشخص اور خصوصیات
اللہ واحد پر ایمان رکھنے والی امت
یوم آخرت پر ایمان
اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان
عبادات
محاسن اخلاق
امت مسلمہ کا اتحاد
اسلام کے معصوم مآخذ (قرآن وسنت)
شریعت، فقہ اور اجتہاد
اسلام، اعتدال پسندی اور جامعیت
اسلام اور انسان
اسلام اور خواتین
اسلام اور خاندان
اسلام اور سماج
اسلام اور اقتصادیات
اسلام اور حدود وتعزیرات
اسلام اور حکومت
اسلام، امن اور جہاد
اسلام اور دہشت گردی
اسلام اور تہذیب
اسلام اور اصلاح
اسلام اور مذاکرات

اسلام اور غیر مسلموں سے تعلقات

اسلام اور مغرب

اسلام اور گلوبلائزیشن

خاتمہ

☆☆☆